جامعہ مدنیہ لاہور کا علمی، ادبی اور اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ

انوارِ مدینہ

نگرانِ اعلیٰ :-

حضرت مولانا سیّد حامد میاں مدظلہ مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انوارِ مدینہ

مدیر اعزازی
پروفیسر یوسف سلیم چشتی
مدیر معاون
حبیب الرحمٰن اشرف

فون
۶۲۹۳۲
قیمت
۶۵ پیسے

جلد : ۲ | ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ ○ جنوری و فروری ۱۹۷۲ء | شمارہ : ۷، ۸

مرتب
حبیب الرحمٰن اشرف
فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور

بدل اشتراک	سالانہ: ۷ روپے	طلبہ کے لیے ۵ روپے	فی پرچہ ۶۵ پیسے

پتہ : جامعہ مدنیہ ○ کریم پارک ○ راوی روڈ ○ لاہور

اِس شمارے میں

اداریہ		۳
اُولٰئِکَ ھُمُ الرّاشِدُون	حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہم	۸
انوارِ صحابہ	حضرت مولانا بشیر احمد پسروری مدظلہ،	۲۲
نعت	جناب سلیم احمد بارہ بنکی	۲۵
معیارِ محبت	حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہ،	۲۶
دعاء کی افادیت واہمیت	حضرت مولانا محمد اجمل مدظلہ،	۲۹
کمالِ انسانی کے راز	حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی	۳۹
نعت	الحاج محمود احمد عارف	۴۲
حاصل مطالعہ	حضرت سید انور حسین نفیس قم مدظلہ،	۴۳
رثاء	حضرت مولانا محمدؐ موسیٰ مدظلہ،	۴۷
تیاری کرد	سید امین گیلانی	۵۱
اقتصادی اور سیاسی مسائل	حضرت مولانا سید محمدؐ میاں مدظلہم	۵۲
ایک مکتوب	پروفیسر محمدؐ انوار الحسن شیرکوٹی	۶۷
اخبار الاولیاء	حضرت سید انور حسین نفیس مدظلہ	۶۸

سعید حامد میاں مہتمم جامعہ مدنیہ طابع و ناشر نے مکتبہ جدید پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ انوارِ مدینہ

جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا

شامتِ اعمالِ ما ----------

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسُولہ الکریم

گذشتہ ایک ہی مہینہ میں ملک جس بھیانک دَور سے گزرا ہے اس کے بارے میں جتنا بھی افسوس کیا جائے بجا ہوگا۔ یہ حادثۂ عظیمہ ایک درسِ عبرت ہے کہ اگر اللہ پر بھروسہ نہ ہو تو کتنی بھی بڑی طاقت کیوں نہ ہو بے کار جاتی ہے اور جو نقصان ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اس دفعہ اس جرمِ غفلت میں پوری قوم ملوث تھی۔ اس لیے پوری قوم کو اس کی سزا ملی۔ قوم نے چین پر بھروسہ کیا۔ امریکی بحری بیڑے پر نظر رکھی، مگر خدا کی طرف رجوع نہ ہوئی۔ لہٰذا ملک کا آدھا حصہ کٹ کر رہ گیا اور ہماری طاقت جو پچھلی جنگ کی بہ نسبت کم از کم تین یا چار گنی زیادہ تھی بے سود ثابت ہوئی۔

اللہ کا وعدہ ہے مگر نیکوکار اور اطاعت شعار مسلمانوں سے وعدہ ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ

تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے کام کیے اُن سے اللہ نے وعدہ فرما لیا ہے کہ ان کو ضرور ملک میں حکمراں بنا دے گا۔ جیسے ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ضرور ان کے لیے ان کا

يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

(پ ۱۸ ، رکوع ۱۳)

دین جما دے جو ان کے واسطے پسند کر دیا ہے اور ان کو خوف کے بجائے امن دے گا وہ میری بندگی کریں گے کسی کو میرا شریک نہ کریں گے اور جو کوئی اسکے بعد ناشکری کریگا سو وہی نافرمان لوگ ہوتے ہیں

افسوس کہ ہمارے دل سے شرک خفی نہیں مٹا۔ ہم نے سامان پر بھروسہ کیا، بڑی طاقتوں پر بھروسہ کیا۔ عمل صالح سے غفلت برتی حتیٰ کہ نمازوں کی طرف بھی جو کہ نہایت ضروری فریضہ ہیں کوئی توجہ نہیں دی۔ اس دفعہ مساجد بھی اسی طرح خالی رہیں جس طرح جنگ سے پہلے تھیں۔ سول ڈیفنس کی ٹریننگ جا بجا ہوتی رہی۔ اگرچہ یہ بھی اس پیمانہ پر نہ تھی کہ جس پیمانہ پر ہونی چاہیئے تھی، کیونکہ ہم میں جذبۂ خدمتِ خلق و ایثار کم ہوتا جا رہا ہے، لیکن سول ڈیفنس کے رضاکار جو بھی اور جتنے بھی تھے وہ بھی یادِ خدا سے غافل رہتے تھے انہوں نے نماز کے فریضہ کی طرف قطعاً التفات نہیں کیا۔

ظاہر ہے جب پوری قوم غفلت شعار ہو تو خدا کی رحمت بھی ہم سے رُخ پھیر لے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔

ہمارے حکام اس شرک خفی اور فسق و فجور میں عوام سے بہت ہی زیادہ آگے تھے۔ انہوں نے ہو سکنے والی فتح کو شکست میں بدل دیا۔ فسق و فجور کا کچھ حال تو اخبارات نے ظاہر کر ہی دیا ہے اور جو نہیں ظاہر ہوا اندازہ یہ ہے وہ زیادہ ہی ہوگا کم نہ ہوگا۔ صرف ذات ستار العیوب نے اس کی پردہ پوشی فرمائی ہوئی ہے۔ ہم بھی اس سے بحث نہیں کرتے۔ ہم شرک خفی کے نتائج بد ہی سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔

ہمارے ملک "پاکستان" کے معرض وجود میں آنے کے وقت سب سے زیادہ کام مسلم لیگ اور علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ جماعت علماء نے کیا تھا۔ مسلم لیگ چند عناصر سے مرکب تھی۔ اس میں نواب، جاگیردار، دفتری عملے، ملازم طبقے اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ تھے۔ ان میں سے اکثر سیاست میں یا تو ناپختہ تھے یا پھر ان کے ذہن میں انگریز کی اطاعت رچی ہوئی تھی۔ ان میں حریت فکر کے بجائے اطاعت شعاری فرنگ موجزن تھی۔ ان کے ذہن اس تمیز سے یکسر خالی تھے کہ انکا سب سے بدترین دشمن وہی ہے جسے یہ اپنا آقا سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ جاننا چاہیئے تھا کہ یہ آقا ہم سے دشمنی رکھتا ہے۔ اگر ہم اس سے وفاداری کریں گے تو وہ اپنے مفاد کے لیے ہمیں قربانی کا بکرا بنا دے گا۔ وہ صرف اپنے مفادات کو ملحوظ رکھے گا نہ کہ ہماری وفاداری کو۔

شروع میں پاکستان کے حکمران بہتر رہے، مگر وہ معدودے چند تھے۔ اس کے بعد آخر حکمران تو اسی طبقہ میں سے آنے تھے وہ آئے اور اپنی ذہنی غلامی سمیت آئے۔ جس کا خاصہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی کو اپنے ذہن میں اپنا آقا تصور کیا جاتا رہے۔

زمانۂ جاہلیت میں خانہ بدوشوں کو جو خوبصورت پتھر نظر آجاتا تھا اُسے اٹھا لیتے تھے اور اس کی پوجا پاٹ شروع کر دیتے تھے گویا اس طرح اپنے شرک کی پیاس کو بجھاتے تھے۔

بالکل یہی حال ہمارے حکام کا رہا کہ بجائے اس کے کہ ہم اپنے لیے کسی بڑی طاقت کو نفع بخش طریقوں پر پابند کر سکیں ہم خود ہی اپنے ذہن میں ان کے غلام ہو گئے اور آزادی جیسی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود آزاد نہ ہوئے۔ ہماری خارجہ پالیسیاں صحیح نہیں رہیں۔ بت افرنگ کے سامنے جھکاؤ زیادہ رہا، حالانکہ اپنے مفاد اور قوم کی ترقی کے لیے بڑی طاقتوں سے صرف نفع حاصل کرنے کی ضرورت تھی یہی ان آقاؤں کے رویہ کا جواب ہو سکتا تھا۔

آخر یہ منحوس گھڑی بھی آگئی کہ جس میں خلاف عقل کام ایک غدارانہ سازش کے تحت کیے جانے لگے، مگر مارشل لاء اور سنسر کی پابندیوں کی بناء پر کوئی لب کشائی نہ کر سکتا تھا۔ مثلاً۔

(۱) شیخ مجیب الرحمٰن کو چھ نکات پر انتخاب لڑنے کی اجازت کیوں دی گئی؟

(۲) انتخابات جیتنے کے بعد انہیں اقتدار کیوں نہیں دیا گیا۔ جبکہ وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ حالات خراب ہو جائیں گے، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ چھ نکات حرفِ آخر نہیں ہیں۔ ان میں ردوبدل ہو سکتا ہے، لیکن نہ انہیں اقتدار دیا گیا نہ ان سے بات کی گئی۔

(۳) اسی دَور میں ہندوستانی مداخلت کار مشرقی پاکستان داخل ہوئے، مگر ان مداخلت کاروں کے داخلہ اور انکی کارروائیوں کی ذمہ واری اس حکومت پر کیوں نہ آئی جو یحییٰ خاں کی نمائندہ تھی اور جسے مارشل لاء کی قوت حاصل تھی اور شیخ مجیب پر کیوں ڈالی گئی جن کی اس وقت تک حکومت ہی قائم نہ ہوئی تھی اور وہ رعایا کے ایک فرد تھے اور انہیں اقتدار دیا ہی نہ گیا تھا۔

اگر دنیا میں اصول چلتے ہیں تو اصولاً مجیب حاکم تھے اور بقول یحییٰ خاں وہ ملک کے ہونے والے وزیر اعظم اور محبِ وطن پاکستانی تھے، مگر چند ہی روز بعد وہ غدار کہلائے گئے اور جیل بھیج دیئے گئے۔ کوئی بتلائے کہ ان دونوں میں اصولاً کون حاکم ہونا چاہیئے تھا اور کون غدار تھا؟

(۴) پھر ایک طاقت ور دفاع کی قوت مشرقی پاکستان منتقل کر دی گئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ اگر مشرقی پاکستان پر حملہ

ہوا تو سارے پاکستان پر حملہ سمجھا جائے گا، مگر جب انڈیا نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تو ہم مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کی سپاہ کی قوت ٹوٹنے کا محض تماشہ دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ جنگ کے شعلے مغربی سرحدوں پر بھی بھڑکنے لگے۔ افواجِ پاکستان نے مغربی محاذوں پر دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اس کے علاقے میں پیش قدمی شروع کی، لیکن صرف چند گھنٹے بعد افواج کی پیشقدمی روک دی گئی اور جہاں افواجِ پاکستان زیادہ آگے بڑھ گئی تھیں وہاں سے فوری حکم کے ذریعے پیچھے ہٹا لیا گیا۔

یہ ممکن تھا کہ مشرقی پاکستان کے شرقی جانب جو ہندوستان کا علاقہ تھا گھیرے میں آجاتا۔ اگر یہ منظوری دی جاتی کہ جنرل نیازی اپنے شمال میں پیش قدمی کریں اور چین کی سرحد تک بڑھ جائیں۔ دوسری طرف فوراً ہی مغربی محاذ پر پیش قدمی کر کے کشمیر لے لیا جاتا۔

یہ دونوں صورتیں یقیناً ممکن تھیں اور اسی طرح مشرقی پاکستان میں چین سے معاہدہ کر کے براہ راست امداد جاری رکھنی ممکن تھی اور ایسی صورت میں ہندوستان لاچار ہو جاتا اور بڑی طاقتوں کا خواب پراگندہ ہو جاتا۔ وہ سب اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرتے اور پاکستان کے آگے انہیں جھکنا پڑتا، لیکن اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں مدد کا بندوبست نہیں کیا گیا اور ہتھیار ڈلوا کر پاکستان کے چہرے پر قیامت تک رہنے والا داغ لگایا گیا اور ملک کے علاوہ افواج کی ساکھ کو زبردست نقصان پہنچایا گیا اور ہو سکنے والی فتح کو شکست میں بدل کر رکھ دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ جو جان بوجھ کر کیا گیا ہے۔ اس کی اصل علت کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اصل علت "شرک خفی" ہے۔ یعنی بیرونی عالمی بڑی طاقتوں کے سامنے جھکنا اور ان کے منشاء پر چلنا ہے۔ انہوں نے ملکر ہماری اطاعت شعاری سے فائدہ اٹھایا اور خدا نے بھی ہمارے ان حکام کو ایسے ہی چھوڑ دیا جیسے انہوں نے خدا کو چھوڑا۔ ان کی خودی اور غیرت سب فنا ہو کر رکھی گئی۔

نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (پ۲۸، رکوع ۶) انہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو اپنی جان بھلا دی۔ یہی لوگ وہ ہیں جو نافرمان ہیں۔

آخر اُن ممالک کو اگر وہ بڑے بھی ہیں۔ ہمارے معاملات اور داخلی امور میں مداخلت کی ضرورت کیا ہے؟ اور کیوں ہم اتنے مجبور بنتے ہیں کہ ان کی مداخلت بسر و چشم قبول کرتے ہیں اور خود کو آئے دن طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کرتے ہیں۔ اگر ہم نے اب بھی اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو مغربی بازو کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔

غرض مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈلوانے اور مغربی پاکستان میں جانباز افواج کی پیش قدمی کو روکنا یا تو یحییٰ کی کمزوری فطرت کے باعث جو سازش کی گئی اس کا نتیجہ تھا یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی اور بات ہے اور ملک کو ذاتی نفع کے عوض چاہے وہ کتنا بھی بڑا نفع کیوں نہ ہو بیچا گیا ہے۔

اور ایسی صورت میں جو تحقیقاتی کارروائی ہو رہی ہے اُسے خفیہ رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آئندہ بھی ایسے مجرم جری ہو جائیں اور ملک کے ساتھ غداری کی رسم بے عیب بن جائے۔

ہم اپنے صدر محترم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انہیں قدرت نے یہ موقع بخشا ہے کہ وہ ملک و ملت کے عوامی نمائندہ کی حیثیت سے خدمت کریں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ انکو مملکتِ پاکستان کی خدمت اپنی مرضیات کے مطابق کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور اکابرین جمعیت کے لیے قانونِ اسلامی کی ترویج و اشاعت آسان فرمائے آمین

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی صحیح راہ پر چلنا آسان فرمائے اور ملک کو متحد رکھنے کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین ۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

حامد میاں

اعتذار

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود رسالہ کی اشاعت میں اس بار پھر تاخیر ہو گئی ہے۔ بناء بریں چند صفحات کے اضافہ کے ساتھ یہ پرچہ دو ماہ کا یکجا شائع کیا جا رہا ہے۔

سالانہ خریداروں کو بارہ ہی رسالے ملیں گے۔ انشاءاللہ

فتنوں کی سرکوبی

قسط ۱۲

اُولٰئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ

"خلافت و ملوکیت" کے جواب میں!

شیخ الحدیث حضرۃ علامہ مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ

حامیانِ صحابہؓ اور معاندین کا فرق و امتیاز

حامیانِ صحابہ کے سامنے تاریخ کے وہ کھلے ہوئے واقعات موجود ہیں جو ہم نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے گذشتہ صفحات میں نقل کیے ہیں، لیکن ان واقعات کی بنا پر تمام ذمہ داری (۱) عبداللہ بن سبا اور ان کے رفقاء (اور ان اہلِ عراق (باشندگان کوفہ و بصرہ) پر آتی ہے جو اقتدارِ قریش اور اقتدار صحابہ کے مخالف تھے جن کے باغی لشکر ذی مروہ اور ذی خشب و اعوص میں رخت انداز ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت کے مستحق بنے۔

مگر جن لوگوں کے دِلوں میں معاذ اللہ حضرات صحابہ کی طرف سے بغض و عناد ہے جو عبداللہ بن سبا کے حامی اور فتنہ انگیزوں کے جانشین ہیں ان کی تمام توانائیاں اور تمام صلاحیتیں اس میں صرف ہوتی ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ملزم قرار دیں وہ گھوم پھر کر ایک ہی تکنک زبان پر لاتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خویش نواز تھے۔

یہ ایک کھلا ہوا فرق ہے اس کو سامنے رکھیے اور ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے بعد ہم سے مسئلہ نہ پوچھیے بلکہ قلم آپ خود اپنے ہاتھ میں لیں اور عبارت لکھنے والے کے متعلق منصفانہ فتویٰ صادر فرمائیں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں۔ (قوسین کے درمیان جو عبارتیں ہیں وہ ہماری ہیں)

حضرت عثمان کے خلاف جو شورش برپا ہوئی اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی سبب کے بغیر محض سبائیوں کی سازش کی وجہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی یا وہ محض اہلِ عراق کی شورش پسندی کا نتیجہ تھی۔ تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے۔ (چہ خوب)

اگر لوگوں میں ناراضگی پیدا ہونے کے واقعی اسباب موجود نہ ہوتے اور ناراضگی فی الواقع موجود نہ ہوتی (درست ہے مگر واقعی اسباب مفتوحہ گروہوں کے منتقمانہ جذبات تھے اور ناراضگی اقتدار اسلام سے تھی) تو کوئی سازشی گروہ شورش برپا کرنے اور صحابیوں اور صحابی زادوں تک کو (یہ غلط ہے۔ صرف چار نام لیے جاتے ہیں۔ محمد بن حذیفہ۔ محمد بن ابی بکر۔ عمرو بن الحمق اور حضرت عمار بن یاسر) اس کے اندر شامل کر لیتے ہیں، کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

ان لوگوں کو اپنی شرارت میں کامیابی صرف اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ اپنے اقربا کے معاملہ میں حضرت عثمانؓ نے جو طرزِ عمل اختیار فرمایا تھا۔ اس پر عام لوگوں ہی میں نہیں، بلکہ اکابر صحابہ تک میں ناراضگی پائی جاتی تھی۔ (خلافت و ملوکیت ص ۳۲۸ و ص ۳۲۹)

(غلط ہے۔ نہ عوام میں ناراضی تھی نہ خواص میں۔ جب یہ شورہ پشت مدینہ منورہ پر چھا گئے تب اقارب عثمان رضی اللہ عنہ کے اقتدار کا ہوّا لوگوں کو دکھایا گیا۔ اس وقت کچھ صحابہ نے فتنہ کو ختم کرنے کے لیے کچھ صورتیں تجویز کیں وہ رفع فتنہ کے لیے تھیں۔ اعتراضات کو صحیح تسلیم کر لینے کی بنا پر نہیں تھیں۔ تفصیل آئندہ آئے گی) (انشاء اللہ)

اقربا نوازی کے الزام کی حقیقت

مودودی صاحب کا الزام یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقربا نوازی کا اثر یہ ہوا کہ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ گئیں۔ (ص ۱۰۰)

اس شورش کی پوری تاریخ جو گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے۔ اس سے خود آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ الزام سراسر غلط ہے افترا اور بہتان ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کسی فعل سے قبائلیت کی کوئی چنگاری نہیں سلگی۔ اس چنگاری کو سلگانے والے اہل عراق تھے جن میں بقول علامہ ابن خلدون رگِ جاہلیت پھڑکی اور ممکن ہے عبداللہ بن سبا کی پارٹی نے ان کی طبیعتوں کا اندازہ لگا کر اس رگ کو پھڑکایا ہو۔

رہ گیا دوسرا اعتراض جس کے متعلق مودودی صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

مگر بدقسمتی سے خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ اس معیار مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے۔ ان کے عہد میں بنی امیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے عطیے دیئے گئے اور دوسرے قبیلے اسے تلخی کیساتھ محسوس کرنے لگے۔ ان کے نزدیک یہ صلہ رحمی کا تقاضا تھا، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ عمر خدا کی خاطر اپنے اقربا کو محروم رکھتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقربا کو دیتا ہوں۔ ایک موقع پر انہوں نے یہ فرمایا کہ ابوبکر بیت المال کے معاملہ میں

اس بات کو پسند کرتے تھے کہ خود بھی خستہ حال رہیں اور اپنے اقربا کو بھی ایسی حالت میں رکھیں، مگر میں اس پر صلہ رحمی پسند کرتا ہوں۔ (ص ۹۹ و ص ۱۰۰ خلافت و ملوکیت)

جو صفحات آپ کے سامنے ہیں ان کے مطالعہ کے بعد آفتاب نیم روز کی طرح روشن اور واضح ہو جائیگا کہ یہ الزامات بھی سراسر افترا اور بہتان ہیں اور خلیفۂ ثالث کا دامن تقدس ان تمام دھبّوں سے پاک ہے، مگر حقیقت پسندانہ فیصلہ کے لیے ہمیں پس منظر پر نظر ڈالنی پڑیگی۔ ہمیں اس سرحد پر پہنچنا ہوگا جہاں دورِ فاروقی ختم ہوتا ہے اور خلافتِ عثمانی کا آفتاب طلوع ہوتا ہے۔

سیّدنا عمر بن الخطاب الفاروق الاعظم رضی اللہ عنہ کے جہاں اور کارنامے بے نظیر ہیں اُن کے دورِ خلافت کا آغاز بھی بے نظیر ہے۔

خلیفۂ اوّل سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کو ایسی مملکت کا سربراہ اور خلیفہ بنایا تھا کہ اس کے اندرونی فتنے ختم ہو چکے تھے۔ مملکت کے ارباب حل وعقد ایک شیرازہ میں منسلک تھے۔ شقاق ونفاق کا نام ونشان نہ تھا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی کہ فاروقِ اعظم نے زمامِ خلافت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ افواج اسلام کے سالارِ اعظم۔ بے نظیر فاتح اور کامیاب ترین سپہ سالار سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا۔ جن کی فتوحات ہر ایک مسلمان کے لیے باعثِ فخر تھیں مگر اس کے خلاف کوئی شورش برپا نہیں ہوئی۔ بیرون مملکت قیصر وکسریٰ کی تمنائیں کچھ بھی ہوں، مگر شورش کسی طرف نہیں تھی اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حسن تدبیر اور حسن سیاست نے مملکت کو اس قابل بنا دیا تھا کہ اس کی طرف سے اقدام ہو سکتا تھا، چنانچہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کی وصیت بھی کر دی تھی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے اس وصیت کو جامۂ عمل پہنایا۔

اس کے برخلاف سیدنا عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک پر بیعت خلافت ہوئی تو حالات مختلف تھے۔ پہلا فرق وہ تھا جس کی بنا پر خلیفۂ دوم نے نہ کسی ایک کو نامزد کیا اور نہ کسی ایک کے لیے سفارش فرمائی بلکہ معاملہ چھ حضرات کے حوالے کر دیا کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنا دیں۔

ایک فرق یہ بھی تھا کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کو سازش کا نتیجہ سمجھا گیا۔ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے منجھلے صاحبزادے عبیداللہ کا یہی احساس تھا جس کی بناء پر آپ نے ہرمزان (سابق والی تستر) کو قتل کر دیا تھا۔ سازش کا قانونی ثبوت فراہم نہیں ہوا۔ اس لیے اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں ہوا۔ لیکن جس چیز کی شہادت فراہم نہ ہو سکے یہ ضروری نہیں ہے کہ اصل میں وہ چیز موجود بھی نہ ہو جب کہ اس کے وہ قرائن موجود ہوں جس کا تذکرہ چند سطروں کے بعد ملاحظہ سے گزریگا۔

یہ حالات کا فرق اندرونِ ملک تھا اور بیرونِ ملک کا حال یہ تھا کہ گویا ایک آتش فشاں تھا جو سیدنا فاروق اعظم کی شہادت پر دفعۃً پھٹ پڑا۔

غور فرمائیے۔ ایران کا بہت بڑا علاقہ فتح ہو چکا تھا۔ اس علاقے کے باشندوں کی گردنیں جھک گئی تھیں، مگر ان کے دل رام نہیں ہوئے تھے۔ یزدجرد (شاہ ایران) زندہ تھا اور اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ ظاہر ہے مفتوحہ علاقوں کے پرانے رؤسا اور سابق امراء جو باقی تھے ان کے دل یزدجرد کے ساتھ تھے۔ سیدنا عمر بن الخطاب کی شہادت میں اگر ان کی خفیہ سازش کو دخل نہیں تھا تو یہ تو ضرور تھا کہ اس کو ان سب نے فال نیک سمجھا اور جیسے ہی شہادت فاروق رضی اللہ عنہ کی خبر پھیلی ان سب نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عَلَمِ بغاوت بلند کر دیئے تمام معاہدے ختم کر دیئے اور اپنی اپنی جگہ اپنے استقلال کا اعلان کر دیا۔

یہ عراق اور ایران کا حال تھا۔ دوسری جانب شام اور مصر کے وہ علاقے تھے جو بازنطینی شاہنشاہیت کے فرماں رواؤں سے حاصل کیے تھے۔ ان کے متعلق ابن جریر طبری کے الفاظ ہیں۔

جاشت الروم حتی استمد من بالشام من جیوشی المسلمین من عثمان مدداً - (طبری ص ۴۶ ج ۵)

روم میں تلاطم برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے جو لشکر شام میں تھے انہوں نے حضرت عثمانؓ سے کمک کی درخواست کی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو رپورٹ خلیفۂ وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجی اس میں یہ تھا۔

ان الروم قد اجلبت علی بجموع عظیمۃ۔ طبری ص ۴۶ ج ۵

روم نے بڑے بڑے لشکروں کو لا کر مجھ پر چڑھائی کر دی ہے۔

اس وقت جبکہ پوری مملکتِ اسلامیہ خطرے میں تھی غور فرمائیے کس نے اس کو سنبھالا۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ وہی لوگ سر آگے پر رکھے ہوئے سامنے آئے جو بقول مودودی صاحب، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے۔

ولید بن عقبہ نے کوفہ کے محاذ سے اقدام کر کے آذربائیجان اور آرمینیہ وغیرہ کو دوبارہ فتح کیا (طبری ص ۴۵ ج ۵) ایک روایت کے بموجب شام کی امداد کے لیے بھی آٹھ ہزار مجاہدین کی فوج بھیجی۔ طبری ص ۴۶ ج ۵ ...

اس وقت جبکہ پوری مملکتِ اسلامیہ خطرے میں تھی غور فرمائیے کس نے اس کو سنبھالا۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ وہی لوگ سر آگے پر رکھے ہوئے سامنے آئے جو بقول مودودی صاحب، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے۔

ولید بن عقبہ نے کوفہ کے محاذ سے اقدام کر کے آذربائیجان اور آرمینیہ وغیرہ کو دوبارہ فتح کیا (طبری ص ۴۵ ج ۵) ایک روایت کے بموجب شام کی امداد کے لیے بھی آٹھ ہزار مجاہدین کی فوج بھیجی۔ طبری ص ۴۶ ج ۵ ...

یہ ۲۴ھ کا واقعہ ہے ولید بن عقبہ کوفہ کے گورنر نہیں ہوئے تھے ابھی گورنر کوفہ حضرت مغیرہ بن شعبہ تھے (رضی اللہ عنہ) یا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ۔ اسی علاقہ میں اسی محاذ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایک دوسرے عزیز کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔ طبری کی روایت ہے ۔

جب حضرت عثمان خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے عبداللہ بن عامر کو کابل بھیجا۔ یہ کابل پہنچے ۔ اس علاقہ پر مکمل فتح حاصل کی۔

(طبری ص ۴۴ ج ۵)

شام و مصر کے واقعات علیحدہ بیان کیے جائیں گے۔ (انشاء اللہ) یہ عراق اور کوفہ کا تذکرہ ہے جہاں تقریباً ڈیڑھ سال بعد حضرت ولید بن عقبہ کو گورنر بنایا گیا۔ پھر تقریباً چار سال بعد بصرہ میں عبداللہ بن عامر کو گورنری کا منصب سونپا گیا۔ حضرات مورخین نے ان حضرات کا تعارف کراتے ہوئے ان کا رشتہ بھی بیان کر دیا۔

مودودی صاحب جیسے نکتہ چین حضرات نے اس رشتہ ہی کو لے لیا۔ ان کے کارناموں کا مطالعہ نہیں کیا یا تجاہل عارفانہ کے طور پر قصداً نظر انداز کر دیا۔

عقبہ بن ابی معیط بیشک بدترین کافر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کمینہ ترین دشمن تھا۔ حضرت عثمان کی والدہ نے اس سے شادی بھی کر لی تھی، مگر یہ کیا بات تھی کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات پر یہ پورا علاقہ باغی ہو گیا تو اسی عقبہ کے لڑکے ولید کو توفیق ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر ان باغیوں کے مقابلہ پر سینہ سپر ہوا اور اسی نے اس خارج شدہ صوبوں کو دوبارہ اسلامی مملکت میں داخل کیا ۔ مودودی صاحب کا یہ فقرہ کتنا مغالطہ انگیز بلکہ توہین آمیز ہے کہ

> حضرت سعد بن ابی وقاص کو معزول کر کے انہوں نے کوفہ کی گورنری پر اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو مقرر فرمایا اور اس کے بعد یہ منصب اپنے ایک عزیز سعید بن عاص کو دیدیا۔ (ص ۱۰۷ خلافت و ملوکیت)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ معزول ضرور ہوئے، مگر کیا اس وجہ سے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس منصب پر اپنے کسی عزیز کو فائز کرنا چاہتے تھے ۔ عزیز کو فائز کرنا ہوتا تو پہلے ہی کیوں نہ نامزد کر دیا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کا تقرر ہی کیوں کیا تھا جو دورِ فاروقی میں اس منصب سے معزول ہو چکے تھے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے ۔

ہر ایک مورخ یہی لکھتا ہے اور یہی حقیقت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی معزولی اس اختلاف کی بنا پر ہوئی جو سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہو گیا تھا۔ ہم پہلے تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ اس اختلاف کی صورت میں لامحالہ

ایک کو معزول کرنا تھا جو خدمات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے وابستہ تھیں وہ ایسی خوبی سے انجام پا رہی تھیں کہ ان کو معزول کر دینا گویا دین کے ایک ستون کو اکھاڑ دینا تھا۔ آپ کی خدمات کا ایک شعبہ وہ تھا جس کے طفیل میں فقہ خصوصاً فقہ حنفی مرتب اور مدوّن ہوا۔ ان کے مقابلہ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو واپس بُلانے میں کوئی ایسا نقصان نہیں تھا۔ لہٰذا ان کو واپس بُلا لیا حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے اب تک فوجی خدمات متعلق تھیں۔ کوفہ کی چھاؤنی ان کا مرکز تھا اور یہیں سے وہ باغی اور سرکش علاقوں کو فتح کر کے اپنا غیر معمولی اثر قائم کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کوفہ کی گورنری کے لیے اس سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہو سکتا تھا جو اس علاقہ کا فاتح ہو۔ اس علاقہ کے فاتح اول حضرت سعد بن ابی وقاص تھے۔ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب کوفہ آباد کیا تو حضرت سعد ہی کو اس علاقہ کا والی بنایا۔ رضی اللہ عنہ۔ بغاوتوں کے بعد اس علاقہ کے فاتح ولید بن عقبہ تھے۔ اب اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو کوفہ کا گورنر بنایا تو سنت فاروقی پر عمل کیا۔ رضی اللہ عنہ۔ مگر مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ ماں جایا ہونے کا لحاظ کیا۔ (معاذ اللہ)

یہ بات تو مودودی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ

اپنے خاندان کے جن لوگوں کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے حکومت کے یہ مناصب دیئے انہوں نے اعلیٰ درجے کی انتظامی اور جنگی صلاحیتوں کا ثبوت دیا اور ان کے ہاتھوں بہت سی فتوحات ہوئیں (خلافت و ملوکیت ص ۱۰۸)

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ولید بن عقبہ کوفہ کے گورنر ہوئے تو جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔

یہ سب سے زیادہ ہر دلعزیز گورنر تھے۔ اہلِ کوفہ ان کے گرویدہ تھے اور ان کی حالت یہ تھی کہ قیام گاہ پر چھاٹک تک نہیں لگوایا تھا۔ (طبری ص ۵۹ ج ۵)

اس کے بعد شورہ پشت شرارت پسندوں کی شرارت کا سلسلہ شروع ہوا ان پر شراب نوشی کا الزام ثابت کر کے ان کو معزول کرایا گیا، لیکن ان شریر شورہ پشتوں کے علاوہ عام باشندگان کوفہ کو ان کی علیحدگی کا اتنا صدمہ ہوا کہ ان لوگوں نے کئی روز تک ماتم کیا۔ (طبری ص ۶۲ ج ۵)

ہر ایک خدا ترس، صداقت پسند سے اپیل ہے کہ وہ انصاف فرمائیں کہ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کیا قصور ہے جس کا الزام اس خلیفہ مظلوم پر لگایا گیا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ولید بن عقبہ کو گھر سے بلا کر گورنر نہیں بنایا نہ چھوٹے عہدے سے دفعتہً بلند کر کے اس منصب پر فائز کیا۔

ولید بن عقبہ اپنی عظیم مجاہدانہ سرگرمیوں سے اس علاقہ کے فاتح بن چکے تھے۔ کیا اس مجاہد فاتح کو پیچھے دھکیل دینا انصاف تھا۔ جس کی شان یہ تھی کہ دورِ صدیقی کے آغاز سے آج تک مختلف منصبوں پر فائز کئے گئے اور جس منصب پر فائز کئے گئے اس کے لیے بہترین اور موزوں ترین ثابت ہوئے پھر قابلِ توجہ یہ ہے کہ پانچ سال تک کوفہ والوں کی آنکھ کا تارہ بنے رہے۔ الزامات ثابت کرنے میں خواہ کوئی حرکت کی گئی ہو، مگر قانونی طور پر جیسے ہی الزام ثابت ہوا اسی اقربا پرور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ضابطہ کی سزا دلوائی پھر اس کو معزول کر دیا۔

اقربا پروری کا تقاضا یہ تھا کہ کوفہ کی گورنری سے معزول کیا گیا تھا تو کسی انتظامی یا فوجی منصب پر ان کو مامور کر دیا جاتا مگر اس سلسلے میں کوئی نرمی اس اقربا پرور سے ظاہر نہیں ہوئی۔ دوسری طرف یہ ولید بن عقبہ کی خود داری تھی کہ علیحدگی کے بعد نظامِ حکومت میں رہنا پسند نہیں کیا بلکہ سیاست سے ہی کنارہ کش ہو کر خانہ نشین ہو گئے (الاستیعاب وغیرہ)

یہ عجیب بات ہے کہ مودودی صاحب کو تیرہ صدیاں گزرنے کے بعد اور عبداللہ بن سبا کی پارٹی والوں کو تقریباً نو سال گزرنے کے بعد یاد آیا کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ایک جرم یہ بھی تھا کہ اپنے ماں جائے کو کوفہ کا گورنر بنایا تھا۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں۔ "دوسرے قبیلے تلخی کے ساتھ محسوس کرنے لگے"۔ یہ احساس کب پیدا ہوا؟ تاریخ شاہد ہے کہ خلافتِ عثمانی کے آخری دور میں اس طرح کی شکائتیں پیدا کرائی گئیں۔ یعنی جب کہ ولید بن عقبہ کے تقدر کو تقریباً نو سال گزر چکے تھے اور تقریباً چار سال ہوئے تھے وہ معزول ہو کر خانہ نشین بھی ہو چکے تھے؟ کیا تاریخ کی کسی بھی کتاب سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جب حضرت ولید کا تقرر ہوا تو لوگوں میں اس لیے تلخی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ حضرت عثمانؓ کے ماں جائے ہیں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ غلط کام کو سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے نہ دین کا مطالبہ (ص ۱۱۶)

مگر مودودی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صحیح کام کو سخن سازیوں سے غلط ثابت کرنا کس چیز کا تقاضا ہے۔

حضرت سعید بن العاص

اسی طرح کا معاملہ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے کہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے حضرت عثمان کا اتنا تعلق ضرور تھا کہ وہ آپ کے ہم جد تھے مگر سعید بن العاصؓ کو پروان چڑھانے والے سیدنا عمر بن الخطاب تھے (رضی اللہ عنہم)

ان کا تازہ کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے معرکۂ طبرستان میں کامیابی حاصل کی تھی اور ان کے درجہ کا امتیاز اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی فوج میں سیدنا حسن حسین ۔ عبداللہ بن عباس ۔ عبداللہ بن زبیر جیسے نوجوان صحابہ اور سیدنا حذیفہ بن یمان جیسے سن رسیدہ بھی شریک تھے (رضی اللہ عنہم)

ان کے تقرر پر نہ کوئی ناگواری ہوئی نہ کسی کو یہ احساس ہوا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار ہیں بلکہ خاص ان لوگوں نے جو حضرت ولید بن عقبہ کے مخالف تھے، ان کا خیر مقدم کیا اور وہ پرتپاک استقبال کیا کہ روزانہ انکی محفل میں حاضر ہوتے تھے۔

ناراضی اس وقت ہوئی جب ازخود یا عبداللہ بن سبا کی پارٹی کے اکسانے سے قریشی اور غیر قریشی کا سوال پیدا ہوا جس کی انتہا اس وقت ہوئی کہ جب یہ مدینہ منورہ گئے تو واپسی پر ان کا راستہ روک لیا اور مدینہ واپس ہونے پر مجبور کیا۔ ان تمام کھلے ہوئے واقعات کی موجودگی میں اُن کے تقرر کو شورش کے اسباب میں وہی شمار کر سکتا ہے جس کا ضمیر انصاف اور حقیقت پسندی سے محروم ہو اور جس کا نصب العین یہ ہو کہ جس طرح بھی ہو سکے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دامن کو ملوث اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت کو مجروح کرے۔

یہ عجیب بات یہاں بھی ہے کہ اگر بقول مودودی صاحب ان کے تقرر پر تلخی محسوس کی گئی تو اس وقت جب یہ منصب سے برطرف بھی کئے جا چکے ہیں۔ یعنی تقریباً پانچ سال پہلے کا فعل اس وقت تلخی پیدا کر رہا ہے۔ جب تلخی کا مواد بھی ختم ہو چکا ہے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ غلط کام کو سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل اور انصاف کا تقاضا ہے نہ دین کا مطالبہ (ص ۱۱۶)

مگر آپ کا یہ ارشاد حضرات صحابہؓ کو مجرم ثابت کرنے کے لیے ہے اور جہاں انکی برأت ثابت ہوتی ہو وہاں آپ کے انصاف کا تقاضا اس کے برعکس ہے۔

اسی طرح کا دجل آمیز۔ پُرفریب جملہ یہ بھی ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بصرے کی گورنری سے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر کو ان کی جگہ مامور کیا۔ (خلافت و ملوکیت ص ۱۰۷)

گویا عبداللہ بن عامر بیکار تھے۔ کہیں روزگار نہیں مل رہا تھا۔ یا ایک خالی آدمی تھے جو مکہ کی مجلسوں میں اپنا وقت تفریحات میں صرف کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ماموں زاد بھائی تھے لہٰذا آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری جیسے جلیل القدر صحابی

کو بصرہ کی گورنری سے معزول کرکے اپنے ماموں زاد بھائی کو ان کی جگہ اس عہدہ پر چپکا دیا۔ (معاذاللہ) یہ تو مودودی صاحب کا حُسنِ ظن ہے۔ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس الزام کے دو پہلو ہیں (۱) حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی معزولی (۲) حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور ان کا تقرر۔ ہم دونوں کی وضاحت علیحدہ علیحدہ کرتے ہیں۔

یہ قطعاً اور صریحاً غلط ہے کہ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدنا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کو بلاوجہ محض اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر بصرہ کی گورنری سے معزول کر دیا۔

مودودی صاحب واقف ہوں یا نہ واقف ہوں مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت ابوموسیٰ کی عظمت اور آپکی جلالتِ قدر سے واقف تھے اور ایسا نہیں کر سکتے تھے، لیکن اُن کو خود اہلِ بصرہ نے مجبور کیا اور اصرار کیا کہ جو کچھ بھی ہو، انہیں یہاں سے ہٹا دو۔

شکایت اور اصرار کرنے کا جو انداز اہلِ بصرہ نے اختیار کیا۔ ہماری ہمت نہیں ہے کہ ہم ان کو اپنے الفاظ میں بیان کریں ہم یہی کر سکتے ہیں کہ نقل کفر کے طور پر ابن جریر کی عبارت کا ترجمہ پیش کر دیں، مگر ترجمہ پیش کر دینے سے پہلے یہ یاد دلا دینا ضروری ہے کہ اسی بصرہ میں وہ گینگ تھا جس کا سربراہ حکیم بن جبلہ تھا جو چوری کیا کرتا تھا اہل ذمہ پر ڈاکے بھی ڈالا کرتا تھا۔ شورش کرنا اور فساد پھیلانا اس کا خاص مشغلہ تھا۔ عبداللہ بن سبا جب بصرہ پہونچا تو اس پارٹی نے اس کی آؤ بھگت کی تھی۔

(طبری ص ۹/۵ تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

اس گینگ کے ہم جنس وہ تھے جن کو قریش کی طرح حضرات صحابہ کی قیادت بھی اکھرنے لگی تھی۔ اکابر صحابہ کی عظمت کو مجروح کرنا ان کا ابتدائی کام تھا۔ اسی قماش کے یہ لوگ ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق کہتے ہیں:

ہمیں ان کی جو باتیں معلوم ہیں وہ ہم آپ سے کہنا نہیں چاہتے۔ پس ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ان کو بدل دیجیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ ان کی جگہ کن کو پسند کرتے ہیں تو غیلان بن خرشہ نے کہا۔ "یہ غلام جس نے ہماری جائدادیں کھالیں (ہڑپ کرلیں) اور جاہلیت کے طریقے ہمارے اندر پھر سے رائج کر دیئے۔ ہر شخص اس غلام کا بدل ہو سکتا ہے (معاذاللہ) ہم اس اشعری کو برداشت نہیں کر سکتے۔ جو اشعری لوگوں کے سامنے اپنے ملک کی عظمت بیان کرتا ہے اور بصرہ کی تحقیر کرتا ہے۔ کسی چھوٹے کو امیر بنا دو (وہ بھی اس کا عوض ہو سکتا ہے۔ جمیع الناس (عوام الناس) میں سے کوئی متوسط درجہ کا ہو نہ چھوٹا ہو نہ بڑا وہ بھی اسی کا عوض ہو سکتا ہے۔ (طبری ص ۵۵/۵)

اے قریش۔ کیا تم میں کوئی خسیس نہیں ہے کہ اس کو ہمارا امیر بنا کر ہم پر بلندی دیدو۔ کیا تم میں کوئی فقیر نہیں ہے کہ اس کو ہمارا حاکم بنا دو۔ یہ اشعری بوڑھا کب تک ہمارے ان شہروں کو کھاتا رہے گا۔ (ایضاً طبری ص ۵۵/۵۶)

(معترضہ) یہ وہی ابوموسٰی اشعری ہیں رضی اللہ عنہ جن کے قلبِ مبارک میں خود بخود اسلام کا جذبہ پیدا ہوا تھا اور اپنے ساتھیوں کو لیکر جو کم و بیش تیس تھے اپنے وطن سے جو دارالکفر تھا نکل کھڑے ہوئے سمندر طے کرنے کے لیے کشتی پر سوار ہوئے۔ بادِ مخالف نے کشتی کو افریقہ کے ساحل پر پہنچا دیا وہاں حبش میں پہنچ کر وہ سیدنا حضرت جعفر رضی اللہ عنہ وغیرہ یعنی ان مہاجرین میں شامل ہو گئے جو مکہ معظمہ سے ہجرت کیے ہوئے تھے۔ پھر وہاں سے عرصہ کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ بارگاہِ رسالت کے حاضر باش رہے۔ قرآنِ پاک سے ان کو ایسا شغف تھا اور ایسے پیارے انداز سے پڑھا کرتے تھے کہ خود آقائے دو جہان نے جن پر قرآن پاک نازل ہوا کرتا تھا اس کی تحسین فرمائی۔ ارشاد ہوا۔

اعطیت مزمارا من مزامیر آل داؤد (متفق علیہ مشکوٰۃ باب جامع المناقب)

تمہیں حضرت داؤد علیہ السلام کی بانسری (خوش الحانی) عطا کر دی گئی ہے۔

اور اس خفیہ جانفشانی اور بلاکشی کی تو کسی کو خبر ہی نہیں ہے جس کو ایک مرتبہ آپ نے خود ہی بیان کر دیا۔ پھر بعد میں پچھتائے کہ میں نے کیوں بیان کیا۔ ہم تو اپنی جان کاہ سرگذشت بیان کر دینے کے عادی نہیں ہیں۔ کچھ اہلِ علم میں بات یہ چل رہی تھی کہ غزوہ ذات الرقاع کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ہم چھ یا سات آدمی ایک غزوہ بن گئے۔ سید الانبیاء محبوب رب العالمینؐ کی رفاقت بابرکت ہم پر سایہ فگن تھی۔ ہم سب کے پاس صرف ایک اونٹ تھا۔ اسی پر یہ چھ آدمی نمبروار سوار ہوتے تھے (اس سنگلاخ میں ہمیں زیادہ تر برہنہ پا چلنا پڑا تھا) نتیجہ یہ ہوا کہ پیروں میں زخم ہو گئے۔ میرے ناخون بھی جھڑ گئے۔ ہم زخمی پیروں پر چیتھڑوں کی پٹیاں باندھا کرتے تھے۔ اسی لیے اس غزوہ کو غزوہ ذات الرقاع کہا جاتا ہے (چیتھڑوں کی پٹیوں والا غزوہ) (بخاری شریف ص ۵۹۲)

اشعری۔ وہی اشعری حضرات ہیں جن کے متعلق سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا تھا۔ ھم منی وانا منھم (بخاری شریف ص ۴۳۸) وہ میرے ہیں میں اُن کا ہوں) اور رات کو جب وہ قرآن پڑھتے ہیں تو میں ان کی قرأت کی آواز سے پہچان لیتا ہوں کہ کون کہاں ٹھیرا ہوا ہے۔ (بخاری شریف)

مودودی صاحب الزام لگاتے ہیں کہ خلیفہ سوم کی اقربانوازی سے قبائلیت کی چنگاریاں سلگیں مگر ان کی نظر بصرہ

پر نہیں جاتی۔ ابھی وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کسی کا تقرر نہیں کیا تھا۔ اس سے پہلے ہی وہاں اشعری اور غیر اشعری کا سوال کھڑا کر دیا گیا تھا اور گورنر کی تبدیلی اسی لیے چاہ رہے تھے کہ وہ یمن کا باشندہ اشعری ہے۔ لیکن اہلِ عراق کی شورش کا ذکر کیا جائے تو مودودی صاحب فرماتے ہیں یہ تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے۔ (خلافت و ملوکیت صہ ۲۰۰)

مودودی صاحب کے معیار پہ تاریخ کا صحیح مطالعہ یہ ہے کہ موضوع روایتوں کو سامنے رکھ کر الزامات تراشے جائیں اور ناکردہ گناہ خلیفہ شہید کو ملزم اور مجرم گردانا جائے۔

جرم کیا تھا

سیدنا حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا جرم کیا تھا جس پہ یہ برہمی پیدا ہوئی۔ طبری کی روایت کے پیش نظر جرم یہ تھا کہ آپ نے جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے یہ فرما دیا تھا کہ اگر سواری میسر نہ آئے تو پیدل ہی روانہ ہو جاؤ۔ خلافت عثمانی کے سال سوم کا یہ واقعہ ہے کہ اہلِ اندیج اور کردوں میں بغاوت پھیل گئی اور کچھ قبیلے (معاذ اللہ) مرتد بھی ہو گئے۔)

سیدنا حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے تقریر کی۔ آپ نے جہاد کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ پیادہ سفر کرو تو اس میں اور بھی ثواب ہے۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ یا کوئی بھی امن پسند تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ فقرہ سبب فتنہ بن جائیگا لیکن شورش پسند نکتہ چینوں نے اس پر اشتعال پھیلانا شروع کر دیا کہ:

"ابو موسیٰ اشعری جو ہمیں پیادہ سفر کے فضائل بیان کرتے ہیں، کیا وہ خود بھی پیادہ سفر کریں گے۔ اگر خود سوار ہو کر جائیں تو ان کی سواریاں چھین لو۔ قول کچھ ہو عمل کچھ۔ اُسے ہرگز برداشت نہ کرو۔"

دیوانہ را ہوئے بس ست۔ وہ پست ہمت بزدل جو جہاد سے جان بچانا چاہتے تھے ان کو بہانہ مل گیا۔ جس روز روانگی کا دن تھا ان کی بھیڑ قصر ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ پر پہنچ گئی۔ حضرت ابو موسیٰ اور اُن کے رفقاء کا سامان چالیس خچروں پہ تھا۔ اس بھیڑ نے خچروں کو گھیر لیا۔ حضرت ابو موسیٰ کی سواری کی باگ پکڑ لی کہ ہمیں پا پیادہ سفر کی ترغیب دیتے ہو، خود عمل نہیں کرتے۔ یہ تمام خچر ہمارے حوالہ کر دو۔ ہم سوار ہو کر جائیں گے۔

بہر حال اس وقت ان فتنہ انگیزوں کو راستہ سے ہٹایا گیا۔ حضرت ابو موسیٰ میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوئے اور یہ لوگ شکایت لے کر بارگاہِ خلافت میں پہنچ گئے۔ (طبری صہ ۵۴ و صہ ۵۵ ج ۵)

یہ ہے وہ تماشہ جس کی انتہا اس پر ہوئی کہ خواہ کسی کو بھیج دو۔ کالے چور کو ہمارا امیر بنا دو۔ مگر ابو موسیٰ کو وہاں

سے ہٹا دو۔ (طبری صہ۵۵ ج ۵)

حضرت عبداللہ بن عامر اور ان کا تقرر

یہ ہے سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی معزولی کا قصہ۔ اب حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے تقرر کا قصہ ملاحظہ فرمائیے:

مودودی صاحب کو موضوع روایتوں کے یہ جملے یاد ہیں کہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

عمر خدا کی خاطر اپنے اقربا کو محروم کرتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقربا کو دیتا ہوں۔

(خلافت وملوکیت ص۱۰۱)

مگر ہمارے سامنے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وہ تقریر ہے جو آپ نے اہل مدینہ کے مجمع عام میں فرمائی تھی۔ جس میں بصرہ اور کوفہ کے لوگ خاص طور پر مدعو کیے گئے تھے اور ان کو منبر کے قریب بٹھایا گیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس تقریر کے ایک ایک جملہ پر حاضرین سے تصدیق لیتے رہے تھے۔ اور حاضرین تصدیق کرتے رہے تھے۔ یہ وہی تقریر ہے جس کو سننے کے بعد اہل مدینہ کا فیصلہ یہ ہوا تھا کہ اس سازش کرنے والے گروہ کو موت کی سزا دی جائے۔ اس تقریر میں آپ نے برسرِ عام فرمایا تھا۔

فاما حبی فانہ لم یمل معھم علی جور بل احمل الحقوق علیھم

مجھے اپنے خاندان والوں سے محبت ضرور ہے۔ مگر یہ محبت کسی ظلم پر کبھی اُن کے ساتھ نہیں جھکی، بلکہ اس محبت نے ان کے اوپر حقوق کا بوجھ لادا ہے۔ (طبری صہ۱۰۳ ج ۵)

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ کے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر کی عمر تقریباً بیس[2] سال ہے (ممکن ہے پوری طرح داڑھی بھی نہ آئی ہو) کہ آپ اُن پر فتح کابل کا بوجھ لاد دیتے ہیں۔

تقریباً یہی عمر حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی تھی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اس فوج کا قائد بنایا تھا جو شام پر حملہ کرنے کے لیے مامور تھی۔ حضرت عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کی بھی تقریباً یہی عمر تھی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ معظمہ کی ذمہ داری اُن کے سپرد کی۔ اسلام کا سب سے پہلا حج آپ ہی کے دورِ امارت میں ہوا۔

یہ عبداللہ بن عامر وہ ناز پروردہ تھے کہ جب بچپن میں سید الثقلین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں پیش ہوئے تو آپ نے لعاب مبارک اُن کے منہ میں ڈالا۔ یہ اس نونہال کی سعادت تھی کہ اس نے لعاب کو نگل لیا۔ اس سعادت مندی

کا اثر خاطر مبارک پر یہ ہُوا کہ آپ نے فرمایا:

ادجو ان یکون سقیا (الاستیعاب صـ۳۲۸ وکذا فی الاصابہ وغیرہ)

مجھے توقع ہے کہ یہ بچہ ہمیشہ سیراب رہے گا۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ توقع پوری ہوئی۔ یہ خود بھی خوش حال و سرسبز رہے۔ بقولِ صاحبِ استیعاب کان شجعًا کریمًا حلیمًا، میمون البقیۃ) کثیر المناقب الاستیعاب صـ۳۸۲

اور جو جائداد آپ کی ملک میں آتی تھی۔ اس میں اگر چشمہ نہیں ہوتا تو چشمہ نکل آتا تھا اور سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی اسی توقع کا ظہور تھا کہ آپ نے عرفات میں پانی کے سقائے بنوا دیئے تھے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے سیّدنا حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا تھا۔ میرا یہ بچہ سیّد ہے۔ اُمید ہے اللہ تعالےٰ اس کے ذریعہ دو بڑی جماعتوں میں صلح کرا دے گا۔ (بخاری شریف صـ۳۷۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو جو سیرابی اور شادابی کی دعا دی تھی غالباً اُسی کی برکت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اس صلح کرانے میں واسطہ بنے جس کے نتیجہ میں کئی سال کی مسلسل پریشانی کے بعد اُمّت نے اطمینان اور سکون حاصل کیا اور گلشن اسلام پر تازگی آئی۔

آپ نے بحکم سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کابل کی طرف اقدام کیا۔ سارا علاقہ فتح کر لیا تو بطورِ ادائے شکر حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور جب نیشاپور پہنچے تو احرام باندھ لیا۔ اتنے لمبے سفر میں اتنے طویل عرصہ تک احرام باندھے رکھنا ان کے جذبۂ فداکاری و قربانی کے لیے باعث تسکین ضرور ہوگا۔ مگر نظرِ شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت عثمان

لہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو یعنی حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور ایک دوسرے عزیز عبدالرحمٰن بن ثمرہ کو سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور ہدایت کر دی کہ اُن کے یہاں جا کر دھرنا دیدو (واطلبا الیہ) کہ ہم صلح کیے بغیر نہیں جائیں گے اور جو شرطیں آپ پیش کریں گے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اُن کو منظور کریں گے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا ذمّہ دار کون ہوگا۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم ہوں گے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان تمام شرائط کو منظور کریں۔ پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جو شرطیں پیش کیں ان کو منظور کیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ان کو منظور کرایا۔ (بخاری شریف صـ۳۷۳)

رضی اللہ عنہ سے آمنا سامنا ہُوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ماموں زاد بھائی کے اس فعل پر ناپسندیدگی ظاہر کی۔

(الاستیعاب والاصابہ وغیرہما)

یہ تھی آپ کی شخصیت۔ باقی جن لوگوں نے سیدنا ابُوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی تھی کہ (معاذ اللہ) یہ بوڑھا ہمارے کام کا نہیں ہے۔ انہیں لوگوں نے اس نوجوان کو سَر پر بٹھایا جس کی عمر اب تقریباً ۲۵ سال تھی۔

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اگرچہ اُن کاملین میں سے تھے جن کو نہ کسی عہدے کے ملنے کی خوشی ہوتی ہے نہ علیحدگی کا غم۔ البتہ اس کا افسوس ہوسکتا ہے کہ آپ کو علیحدہ کرانے کے لیے نہایت بھونڈا طریقہ اختیار کیا گیا اور اس بناء پر جدید تقرر سے بھی ناگواری ہوسکتی تھی۔ لیکن آپ نے اس تقرر پہ مسرت ظاہر کی اور خود ہی اہلِ بصرہ کو نوجوان گورنر کی آمد کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

یأتیکم غلام خرّاج ولاّج کریم الجدّات والخالات والعمات یجمع لہُ الجندان۔

(طبری ص ۵۵۔ ج ۵)

تمہارے یہاں ایک نوجوان آرہا ہے، نہایت ہوشیار، نہایت چُست نجیب الطرفین دونوں لشکر اس کے ماتحت ہوں گے۔

دیگر مورخین

مودودی صاحب فرماتے ہیں۔ یہ تمام واقعات اس امر کی ناقابلِ تردید شہادت بہم پہنچاتے ہیں کہ فتنہ کے آغاز کی اصل وجہ وہ بے اطمینانی ہی تھی جو اپنے اقربا کے معاملے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کی وجہ سے عوام اور خواص میں پیدا ہوگئی تھی اور یہی بے اطمینانی اُن کے خلاف سازش کرنے والے فتنہ پرداز گروہ کے لیے مددگار بن گئی۔ یہ بات تنہا میں ہی نہیں کہہ رہا بلکہ اس سے پہلے بہت سے محققین یہی کہہ چکے ہیں۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۲۳)

اس کے بعد مودودی صاحب نے تین حضرات کے اقوال نقل کیے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ ہم ان حضرات کی تقلید کیوں کریں جبکہ کھُلے ہوئے واقعات ہمارے سامنے ہیں جن کو پہلے بیان کیا جاچکا ہے اور انہیں حضرات مؤرخین کے حوالہ سے بیان کیا جاچکا ہے جن پر یہ سب حضرات اعتماد کرتے ہیں۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

بااین ہمہ ہم ہر ایک کا جواب آگے دیں گے (انشاء اللہ)۔

أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ

انوارِ صحابہ رضی اللہ عنہم

حضرۃ مولانا بشیر احمد صاحب پسروری مدظلہٗ خلیفۂ مجاز حضرۃ لاہوریؒ

حضرت ابُو عبیدہ عامر بن عبداللہ بن جراحؓ

یہ ابو عبیدہ بن جراح رضؓ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا لقب "امین الامّۃ" ہے، یہ لقب آپ کو دربارِ رسالت سے ملا تھا۔ آپ انتہائی جلیل القدر صحابہ رضؓ میں سے تھے۔ انہوں نے حضرت عیاض بن غنم کو حمص کا کمشنر بنا کر بھیجا، بعد میں ان کی وفات ہوگئی۔ یہ خلافت فاروقی کا زمانہ تھا۔ حضرت امیر عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ جس کو امین الامّت نے کسی منصب سے سرفراز کیا ہو ہم اس کو اس سے معزول نہیں کریں گے۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضؓ خلافتِ فاروقی میں ۱۸ھ کو طاعون کی وجہ سے عَمْوَاس (بیت المقدس کے قریب ایک بستی) میں اٹھاون برس کی عمر پاکر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

حضرت عمرو بن عبسہ رضؓ

انہیں طبعاً بُت پرستی سے نفرت تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ لوہے اور پتھر کے خود تراشیدہ بُت اور مجسمے نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ حضرت عمرو بن عبسہؓ فرماتے ہیں کہ میری ملاقات اہل کتاب کے ایک بہت بڑے عالم سے ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ موجودہ دینوں میں سب سے اچھا دین کونسا ہے۔ اس عالم نے کہا:

ایک نبی کے پیدا ہونے کا زمانہ بہت قریب ہے اور یہ آخری نبی ہوں گے۔ وہ نبی جو دین پیش کریں گے وہ دنیا بھر کے ادیان سے بہتر اور سچا ہو گا۔ اب ان کے ظہور کا وقت بہت قریب ہے۔ عمرو بن عبسہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں اس نبی آخرالزمان کے ظہور کا منتظر اور متلاشی رہا۔ میری بستی میں جو آدمی بھی مکہ سے آتا میں اس سے دریافت کرتا رہتا کہ کوئی نئے نبی مبعوث ہوئے ہیں یا نہیں۔ اسی جستجو میں کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ عبدالمطلب کے خاندان میں سے ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور وہ قوم قریش کو شرک اور بت پرستی سے منع کرتا ہے۔ یہ سن کر میں فوراً مکہ پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درج ذیل سوالات کیے:

عمرو بن عبسہ: آپ کون ہیں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: میں محمدؐ بن عبداللہ، اللہ تعالیٰ کا فرستادہ نبی ہوں۔

عمرو بن عبسہ: نبی کون ہوتا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: نبی وہ ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی راہنمائی کے لیے منتخب فرمائیں۔

عمرو بن عبسہ: آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعوت و اصلاح کا کیا پیغام لائے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام دیا گیا ہے کہ:

۱۔ شرک اور بت پرستی کو بالکل چھوڑ دیا جائے:

۲۔ ہر قسم کی عبادت اور بندگی کی مستحق صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ذات والا صفات ہے۔

۳۔ قتل اور خون ریزی کو بند کر کے دنیا میں امن اور اخوت سے زندگی بسر کی جائے۔

۴۔ برادری اور خاندان میں قطع رحمی کے بجائے صلہ رحمی کو فروغ دیا جائے۔

عمرو بن عبسہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ زریں اصول سُن کر میں نے فوراً اسلام قبول کر لیا اور پھر عرض کیا کہ حضرتؐ کیا اب میں یہیں قیام پذیر رہوں یا گھر واپس چلا جاؤں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اب گھر چلے جاؤ اور پھر جب میرے غلبہ کی خبر سنو تو میرے پاس پہنچ جانا۔ چنانچہ عمرو بن عبسہ اس ہدایت کی روشنی میں گھر روانہ ہو گئے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ عالیہ کی طرف ہجرت کی خبر پہنچی تو حضرت عمرو بن عبسہ بھی حضورؐ کے دربارِ پُر انوار میں حاضر ہو گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آپ نے خلافتِ عثمانی

میں وفات پائی۔

حضرت عامر بن فہیرہ

یہ غلام تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں خرید فرما کر آزاد فرما دیا تھا۔ حضرت عامر بن فہیرہ نے بہت جلدی اسلام قبول کر لیا تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ہجرت کر کے غارِ ثور میں قیام فرما ہوئے تو حضرت عامر روزانہ حضرت صدیق اکبرؓ کا ریوڑ وہاں لے جا کر دودھ پیش کرتے رہتے تھے۔ تین دن تک یہی خدمت انجام دیتے رہے، جنگ بدر میں بھی شریک ہو کر سعادت ابدی حاصل فرمائی۔

حضرت عامر کی شہادت

جب بئر معونہ کے علاقہ میں آنحضرت نے تبلیغ کے لیے صحابۂ کرام کی ایک جماعت روانہ فرمائی تو حضرت عامر بھی اُن میں شریک کیے گئے۔ حضرت عامر بن فہیرہؓ اسی موقع پر چالیس برس کی عمر پا کر عامر بن طفیل کے ہاتھوں ۴ھ میں شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کے وقت نور کی ایک لمبی شعاع بلند ہوئی اور آسمان تک پہنچی۔ حضرت عامر بن فہیرہؓ کی میت کو شہداء کرام کی لاشوں میں تلاش کیا گیا، لیکن انتہائی تلاش کے باوجود ان کا جسم مبارک نہ مل سکا، گویا فرشتے اٹھا کر آسمان پر لے گئے اور اُن کا قاتل عامر بن طفیل انکی شہادت کا عجیب حیرت انگیز نظارہ دیکھ کر فوراً مشرف باسلام ہو گیا۔ حضرت عامر بن طفیلؓ سے آنحضرت نے عامر بن فہیرہ کی میت کے متعلق دریافت فرمایا۔ عامر بن طفیل نے کہا کہ ان کی میت کو فرشتے آسمان کی طرف اٹھا کر لے گئے اور فرشتوں ہی نے ان کے غسل وغیرہ کا انتظام کیا۔ (استیعاب ج ۲)

حضرت عمرو بن قرہ

حضرت صفوان بن اُمیہ بیان کرتے ہیں کہ ہم بیٹھے ہوئے تھے عمرو بن قرہ دربار میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ یا رسول اللہ مجھے تو دف اور قوالی کے ذریعے سے ہی رزق ملتا ہے اس لیے مجھے ان امور کی اجازت ہونی چاہیئے، کیونکہ یہی میرے معاش کا ذریعہ ہے اور میں عہد کرتا ہوں کہ راگ قوالی میں فحش بیانی اور بے حیائی کا مضمون قطعاً استعمال نہ کرونگا۔ یہ سُن کر جناب نے فرمایا کہ میں ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اپنے معاش کے لیے کوئی اور باعزت ذریعہ تلاش کرو یقین کرو کہ جائز اور پسندیدہ ذریعہ سے رزق حلال تلاش کرنا جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے اور خوب سمجھو کہ اللہ کی رحمت نیکوکار اور سچائی پسند تاجروں کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ (اصابۃ ص۱۲)

از جناب سلیم احمد صاحب بارہ بنکی

نعت

اللھم صل علی النبی الامی

طبیعت تھی میری بہت مضمحل
کسی کام میں بھی نہ لگتا تھا دل

بہت مضطرب تھا بہت بے حواس
کہ مجھ کو زمانہ نہ آیا تھا راس

نہ امید کوئی نہ کوئی امنگ
کہ آیا تھا میں اپنے جینے سے تنگ

نہ شب کو کبھی چین سے سو سکوں
نہ کھُل کر کسی بات پر رو سکوں

میرے دل میں احساسِ غم رم گیا
غبار آئینہ پر بہت جم گیا

مجھے ہو گیا تھا اِک آزار سا
میں تھا اپنے اندر سے بیمار سا

یونہی کٹ رہی تھی میری زندگی
کہ اِک دن نویدِ شفا مل گئی

مجھے زندگی کا سلام آگیا
زباں پر محمدؐ کا نام آگیا

محمدؐ قرارِ دلِ بے کساں
کہ نامِ محمدؐ سے آرامِ جاں

محمدؐ ہے ہر قلب کا مدّعا
محمدؐ دوا ہے محمدؐ شفا

محمدؐ سے تابندہ بزمِ حیات
محمدؐ سے قائم ہیں یہ شش جہات

محمدؐ کہ شاہد بھی مشہود بھی
محمدؐ کہ حامد بھی محمود بھی

محمدؐ بشیر و محمدؐ نذیر
محمدؐ سراج و محمدؐ منیر

محمدؐ رفیع و حکیم و کریم
محمدؐ شفیع و رؤف و رحیم

محمدؐ کلیم و محمدؐ کلام
محمدؐ پہ لاکھوں درود و سلام

درس حدیث

معیارِ محبّت

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا سیّد حامد میاں مدظلہ

عَنْ عبدالرحمٰن بن ابی قراد انّ النَّبِیّ صلی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلّم تَوَضَّأَ یَوْمًا فَجَعَلَ اَصْحَابُہٗ یَتَمَسَّحُوْنَ بِوُضُوْئِہٖ۔ فَقَالَ لَھُمُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا یَحْمِلُکُمْ عَلٰی ھٰذَا۔ قَالُوْا حُبُّ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یُّحِبَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اَوْ یُحِبُّ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ فَلْیَصْدُقْ حَدِیْثَہٗ اِذَا حَدَّثَ وَلْیُؤَدِّ اَمَانَتَہٗ اِذَا اؤْتُمِنَ وَلْیُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَہٗ۔

ترجمہ: حضرت سرورِ کائنات صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے صحابی حضرت عبدالرّحمٰن بن ابی قراد فرماتے ہیں کہ اپنے جسم پر آقائے نامدار صلی اللّٰہ علیہ وسلّم نے ایک دن وضو فرمایا۔ آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے وضو کا پانی اپنے ہاتھوں میں لے کر ملنا شروع کر دیا۔ آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تمہیں اس بات پر کیا چیز آمادہ کر رہی ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: "اللّٰہ اور اس کے رسول کی محبّت"۔ آقائے نامدار صلّی اللّٰہ نے ارشاد فرمایا کہ جسے یہ بات اچھی لگے کہ اللّٰہ اور اس کے رسولؐ سے (صحیح) محبّت کرے یا اللّٰہ اور اس کا رسولؐ اس سے محبّت کا معاملہ کرنے لگیں، تو اسے چاہیے کہ ہمیشہ سچ بولے۔ ہمیشہ امانت دار رہے اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

تشریح: ایک مرتبہ جناب رسالت مآب صلی اللّٰہ علیہ وسلّم وضو فرما رہے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللّٰہ علیہم اجمعین آپؐ کے وضو کا پانی زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے، بلکہ ہاتھوں میں لے کر اپنے جسم پر تبرّکاً مل رہے تھے۔ صحابہ کرامؓ کی اس وارفتگی کو دیکھ کر آقائے نامدار (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) نے دریافت فرمایا کہ تم کس لیے ایسا کر رہے ہو؟ عرض کیا کہ ہمیں اللّٰہ تعالےٰ اور اس کے رسول (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) سے محبّت ہے۔ اسی محبّت کی وجہ سے ایسا

کر رہے ہیں۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر ارشاد فرمایا کہ جو آدمی یہ چاہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صحیح محبت کرے یا اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا محبوب بن جائے، تو اس پر یہ تین باتیں لازم ہیں :

پہلی یہ بتلائی کہ ہمیشہ سچ بولے، کیونکہ جھوٹ بہت بُری چیز ہے۔ حدیث شریف میں جھوٹ کی بہت برائی بیان ہوئی ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا مسلمان بُزدل بھی ہوتا ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، ہاں ہو سکتا ہے۔ انہوں نے پھر دریافت کیا کہ کیا مسلمان جھوٹا بھی ہوتا ہے؟ تو فرمایا: "لا" نہیں جھوٹ مسلمان کی شان سے بعید ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو کامل الایمان ہوگا وہ جھوٹ نہ بولے گا۔ جھوٹ سے شریعتِ مطہرہ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ جھوٹا انسان نہ صرف مخلوق کی نظروں میں گرا ہوا ہوتا ہے، بلکہ اللہ کے ہاں بھی وہ ذلیل ہوتا ہے۔ اللہ کے ہاں سچّوں کی قدر ہے۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے سچّے آدمیوں کی بہت تعریف فرمائی ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے: وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ سچّوں کے ساتھ رہو۔

ہاں اگر سچّی بات کہنے میں فساد کا خطرہ ہو تو فساد دبانے کے لیے گول مول بات کہہ دینی یا بالکل خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

"دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز"

آپؐ نے دوسری بات یہ بتلائی کہ اگر امانت رکھی جائے، تو ادا کر دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز بطورِ امانت رکھی جائے وہی چیز واپس کر دے۔ اس میں تصرّف ہرگز نہ کرے۔ رازداری کی بات بھی امانت ہوتی ہے۔ اس کے افشاء و اظہار کرنے کی بھی سخت ممانعت آئی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ اگر بات کرنے والا نہیں اس کے افشاء و اظہار سے روک دے تب تو وہ امانت ہے، نہ کہے تو امانت نہیں، بلکہ اگر وہ زبان سے منع نہ بھی کر سکے مگر آپ نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس کے اظہار سے اسے دکھ ہوگا، تو یہ بھی امانت ہے۔ اس کا اظہار بھی گناہ ہے۔ مثلاً آپ سے کسی نے کوئی بات کہی اور پھر اِدھر اُدھر دیکھا (جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی اور تو نہیں سُن رہا؟) تو اگرچہ آپ سے وہ یہ نہ کہے کہ میری بات کا اظہار نہ کرنا، مگر پھر بھی آپ کو اظہار نہیں کرنا چاہیے؛ البتہ اگر کوئی ایسی بات ہو کہ جس کے چھپانے میں فساد کا خطرہ ہو یا کسی کی آبرو، جان،

مال کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو چھپانا ضروری نہیں، بلکہ اظہار ضروری ہے۔ اس صورت میں لازم ہے کہ جس کو ناحق نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اسے خبر کر دیں تاکہ وہ اپنی حفاظت کر سکے۔

تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ پڑوسی کے ساتھ حُسنِ سلوک کرے۔ پڑوسیوں سے حُسنِ سلوک کی بہت تاکید آئی ہے جو بارہا بیان کر چکا ہوں۔

ایک صحابی نے ایک روز رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ میں اچھے کام کر رہا ہوں یا بُرے؟ تو آقا (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے فرمایا کہ پڑوس سے اندازہ لگا لیا کریں یعنی اگر وہ اچھا کہیں تو اچھے ہو، ورنہ بُرے ہو۔

مذکورہ بالا حدیث شریف میں آقائے نامدار (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے محبّت کا ایک معیار بتلایا ہے جس سے ہر آدمی کو جانچا جا سکتا ہے۔ اگر ایک آدمی برابر جھوٹ بولے، امانت میں خیانت کرے، پڑوسیوں کو تنگ کرے مگر اس کے باوجود وہ اللہ اور اس کے رسول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی محبّت کا دعوے دار ہے، تو ایسا شخص یقیناً کاذب ہے، مُحِب ہرگز نہیں۔ حقیقی اور سچّا مُحِب وہی ہوتا ہے جو محبوب کی ہر بات کو تسلیم کرے، اس کا ہر حکم خوشی سے بجا لائے۔ وہ مُحِب نہیں جو بات تو کوئی بھی نہ مانے مگر زبان سے محبّت کے بڑے بڑے دعوے کرے۔ فقط زبانی دعوے کا کوئی اعتبار نہیں۔

خلاصہ یہ نکلا کہ اللہ اور اس کے رسول کے مُحِب اور محبوب وہی ہوتے ہیں جو اُن کے حکموں پر چلتے ہیں، نافرمانی نہیں کرتے۔

اللہ تعالےٰ ہمیں صراطِ مستقیم پر چلائے ـــــ آمین

حیاتِ شیخ الاسلام

حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ کی جدید سوانح حیات پہلی مرتبہ مفتی اعظم مولانا مفتی محمود مدظلہٗ و دیگر اکابر کی تقاریظ سے مزیّن ہو کر چھپ چکی ہے۔ قیمت ۳ روپے پچھتر پیسے (طلبہ کے لیے خاص رعایت)

ـــــ پتہ: (جناب) مقصود احمد جالندھری۔ خیر المدارس۔ ملتان ـــــ

دعاء کی افادیت و اہمیّت

وللدعوات تاثیر بلیغ وقد ینفیہ اصحاب الضلال

(قصیدہ بدء الامالی)

لا تسئلن بنی آدم حاجۃ وسئل الذی ابوابہ لا تحجب

اللہ یغضب ان ترکت سؤالہ وبنی آدم حین یسأل یغضب

(فیض القدیر)

خطیب اسلام حضرۃ مولانا محمد اجمل صاحب مدظلہ خطیب جامع مسجد رحمانیہ لاہور

آدابِ دعاء

معمولی دنیوی بادشاہوں بلکہ ان کے ماتحت حاکموں کے سامنے درخواست پیش کرنے کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ غلط طریقے پر مانگنے کا نتیجہ نہ صرف محرومی ہوتی ہے، بلکہ بعض اوقات سائل حاکم کے عتاب کا شکار ہو جاتا ہے۔

مدارج السالکین ص ۳۹۱ ج ۲ پر علامہ ابن قیم جوزی فرماتے ہیں:

وَاَدَبُ الْمَرْءِ عُنْوَانُ سَعَادَتِہٖ وَفَلَاحِہٖ۔ وَقِلَّۃُ الْاَدَبِ عُنْوَانُ شَقَاوَتِہٖ وَبَوَارِہٖ وَمَا اسْتُجْلِبَ خَیْرُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ بِمِثْلِ الْاَدَبِ وَلَا اسْتُجْلِبَ حِرْمَانُہَا بِمِثْلِ قِلَّۃِ الْاَدَبِ۔

ترجمہ: آدمی کا با ادب ہونا اس کی سعادت اور کامیابی کی علامت ہے اور بے ادب ہونا اسکی شقاوت اور ہلاکت کی دلیل ہے اور دین و دنیا کی بھلائی کا حاصل ہونا ادب پر ہی موقوف ہے اور ان سے محرومی قلت ادب کے باعث ہی ہوتی ہے ؎

ادب تاجیست از فضلِ الٰہی منہ بر سر بر و ہر جا کہ خواہی

اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ احکم الحاکمین کے دربارِ عالیہ میں درخواست پیش کرنے کے آداب نہ ہوں؛ چنانچہ علامہ ابن القیمؒ مدارج السالکین ص ۳۶۸ ج ۲ میں فرماتے ہیں: وَتَأَمَّلْ اَحْوَالَ الرُّسُلِ صَلَوَاتُ اللّٰہِ وَ

سَلَامُہٗ عَلَیْہِمْ مَعَ اللہِ وَخِطَابِہِمْ وَسُؤَالِہِمْ کَیْفَ کَانَتْ تَجِدُھَا کُلَّھَا مَشْحُوْنَۃٌ بِالْاَدَبِ قَائِمَۃٌ بِہٖ۔

ترجمہ: اگر تو انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کی مناجات اور معروضات میں غور و فکر کرے گا کہ وہ جناب باری سبحانہٗ و تعالےٰ کے حضور میں کس انداز کے تھے تو سب کو انتہائی ادب سے متصف پائے گا۔

اور ابن المجالس السنیہ شرح اربعین نوویہ صہ ۵۷ میں علامہ شیخ احمد الفشنی فرماتے ہیں:

قَالَ اَبُوْعَلِیّ الرُّوْذَبَارِیُّ اَلْعَبْدُ یَصِلُ بِاَدَبِہٖ اِلٰی رَبِّہٖ وَبِطَاعَتِہٖ اِلَی الْجَنَّۃِ

ترجمہ: ابو علی روزباری فرماتے ہیں ادب کی وجہ سے بندہ خُدا تعالےٰ تک پہنچتا ہے اور بندگی و طاعت کی بدولت جنّت تک۔

اور حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ ایک رات کو نماز سے فراغت کے بعد میں نے اپنے پاؤں کو محراب میں دراز کر دیا، تو غیب سے آواز آئی، کیا بادشاہوں کی مجالس میں بیٹھنے کا یہی طریقہ ہے، تو میں نے عرض کیا کہ اس طرح ہرگز نہیں؛ چنانچہ اس کے بعد میں نے ساری زندگی پھر کبھی پاؤں اس طرح دراز نہیں کیا۔

اور نیز ایک عارف سے منقول ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ میں نے ایک بار حرم شریف میں اپنے پاؤں کو دراز کیا تو ایک خاتون نے مجھے ٹوکا۔ اور کہا کہ ادب کے ساتھ بیٹھو، ورنہ تمہارا نام مقربین کی فہرست سے کاٹ دیا جائیگا۔

از خدا خواہیم توفیقِ ادب بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

بہرحال اس شہنشاہِ حقیقی کے دربارِ عالیہ کے بھی آداب ہیں (شرح اربعین للفشنی صہ ۵۷، ۵۸) جو قرآنِ مجید و احادیثِ شریفیہ میں بیان فرما دیے گئے ہیں۔

اب اس رسالہ حافلہ و عجالہ نافعہ میں چند آداب و شرائط بسلسلہ دعا آئندہ اوراق میں آپ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ آپ ان کو ملحوظ فرما کر اپنے مقاصدِ دارین میں کامیابی سے ہمکنار ہوسکیں۔

امام قرطبیؒ اپنی تفسیر صہ ۳۱۱ ج ۲ میں فرماتے ہیں: قَالَ ابْنُ عَطَاءٍ اِنَّ لِلدُّعَاءِ اَرْکَانًا وَاَجْنِحَۃً وَاَسْبَابًا وَاَوْقَاتًا۔ فَاِنْ وَافَقَ اَرْکَانَہٗ قَوِیَ۔ وَاِنْ وَافَقَ اَجْنِحَتَہٗ طَارَ فِی السَّمَاءِ وَاِنْ وَافَقَ مَوَاقِیْتَہٗ فَازَ وَاِنْ وَافَقَ اَسْبَابَہٗ اَنْجَحَ۔ اھ

ابن عطاءؒ فرماتے ہیں کہ دُعا کرنے والے کو چاہیے کہ دُعا کے ارکان اور اس کے بازو اور اس کے اسباب

اور اس کے خاص اوقات کو ملحوظ رکھے، تاکہ اس کی دعائیں طاقت پرواز ہو کر دربارِ عالیہ میں پہنچنے کے بعد مژدہ اجابت لا سکے ؎

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس در بند آن مباش کہ نشنید یا شنید

ادب وَحَقُّهٗ اَنْ یَّسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ اور آداب دعاء سے ایک یہ ہے کہ دُعا قبلہ رُخ ہو کر مانگے

تشریح سمت قبلہ ایک جہت محترم ہے۔ اس کے شرعی آداب ہیں جو اپنے مقام پر مذکور ہیں۔ حضرت امام شعرانیؒ لواقح الانوار القدسیہ صـ ۵۱۱ پر فرماتے ہیں کہ باری تعالےٰ کے ارشاد کے مطابق وَحَیْثُمَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ کے عموم پر عمل کرتے ہوئے اپنی ہر مجلس میں قبلہ رُخ بیٹھنا چاہیے۔ ہاں اگر مجلس میں دیگر افراد بھی موجود ہوں تو پھر اہلِ مجلس کے حقوق کا خیال کرتے ہوئے ان کی طرف متوجّہ ہو کر بیٹھنا چاہیے۔

طبرانی میں باسناد حسن روایت ہے: اِنَّ لِكُلِّ شَیْءٍ سَیِّدًا وَ اِنَّ سَیِّدَ الْمَجَالِسِ قِبَالُ الْقِبْلَةِ۔

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ ہر چیز کا ایک سردار ہوتا ہے اور نشستوں میں سب سے اچھی اور سردار نشست یہ ہے کہ انسان قبلہ رُخ ہو کر بیٹھے، نیز طبرانی کی ایک روایت میں ہے: اِنَّ لِكُلِّ شَیْءٍ شَرَفًا وَ اِنَّ شَرَفَ الْمَجَالِسِ مَا اسْتُقْبِلَ بِهِ الْقِبْلَةَ۔ ترجمہ: ہر چیز کے لیے ایک شرف ہے اور مجالس کا شرف قبلہ رُخ ہونے میں ہے۔

اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ بھی امداد الفتاویٰ ج ۴ صـ ۵۷ میں مقاصد حسنہ سے یہ احادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ ان روایات سے مستقبل قبلہ بیٹھنے کا نُدب ثابت ہوتا ہے، بلکہ اگر بعض طرق اعتبار سے ضعف بھی مان لیا جائے، تب بھی فضائلِ اعمال میں حدیث ضعیف بھی کافی ہے۔

باقی دُعا کے وقت قبلہ رُخ ہونے کے متعلق زین الحلم شرح عین العلم صـ ۱۰۲ ج ۱ میں ملّا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

رَوَیٰ مُسْلِمٌ عَنْ جَابِرٍؓ اَنَّهٗ عَلَیْهِ السَّلَامُ اَتَی الْمَوْقِفَ بِعَرَفَةَ وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَلَمْ یَزَلْ یَدْعُوْ حَتّٰی غَرَبَتِ الشَّمْسُ

ترجمہ: امام مسلمؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم میدانِ عرفات میں

تشریف لائے اور قبلہ رُخ ہو کر دعا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا۔

علامہ طحطاویؒ مراقی الفلاح کے حاشیہ میں نمازِ استسقاء کے سلسلۂ بیان میں فرماتے ہیں :

وَيَقُوْمُ الْاِمَامُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ حَالَ دُعَائِهٖ لِاَنَّهٗ اَفْضَلُ وَاَقْرَبُ الْاِجَابَةِ (طحطاوی صـ۳۰۱)

ترجمہ : اور امام بوقتِ دُعا قبلہ رُخ ہو کر کھڑا ہو، کیونکہ قبلہ رُخ ہو کر کھڑے ہونا افضل بھی ہے اور دعا کی قبولیت کا باعث بھی۔

(مزید تفصیل کے لیے تفسیر قرطبی صـ۲۲۴ ج ۷ سورۃ اعراف ملاحظہ فرمائی جائے)

فائدہ : مجالس السنیہ شرح اربعین نوویہ علامہ شیخ احمد الفشنیؒ صـ۵۸ پر فرماتے ہیں :

وَقَالَ بَعْضُهُمْ مَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلٰى وَلِيٍّ اِلَّا هُوَ مُسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةِ

ترجمہ : اور بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ جب کسی ولی پر کسی معرفت کے بھید کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو یہ اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ اس کا رُخ قبلہ کی جانب ہو۔ ۱۱

حَكٰى اَنَّ رَجُلًا عَلَّمَ وَلَدَيْنِ الْقُرْاٰنَ عَلَى السَّوَاءِ فَكَانَ اَحَدُهُمَا يَقْرَاُ وَهُوَ مُسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةِ فَحَفِظَ الْقُرْاٰنَ قَبْلَ صَاحِبِهٖ بِسَنَةٍ ؛

ترجمہ : بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے دو لڑکوں کو حفظِ قرآنِ مجید بیک وقت شروع کرایا۔ تو ایک ان میں سے قبلہ رُخ ہو کر یاد کیا کرتا تھا؛ چنانچہ اس نے اپنے بھائی سے ایک سال پہلے ہی حفظ کر لیا۔

تذییل : نماز میں قبلہ کا تعین کیوں ضروری ہوا؟ اور پھر بیت الحرام کو ہی قبلہ کیوں قرار دیا گیا؟

اس کا جواب مختصراً یہ ہے :

۱ــــ اللہ تعالےٰ نے انسان کے اندر دو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں : ۱۔ قوتِ عقلیہ، جو مجردات و معقولات کا ادراک کرتی ہے۔ ۲۔ قوتِ خیالیہ، جو عالمِ اجسام میں تصرف کرتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ قوتِ خیالیہ، قوتِ عقلیہ کی مقارنت و مصاحبت سے باز رہتی ہو۔ اسی لیے جب انسان کسی ایسے امر کا تصوّر کرنا چاہتا ہے، جو محض عقلی ہو تو وہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ذہن میں اس امرِ عقلی کے لیے ایک صورت خیالیہ وضع کرے، تاکہ وہ صورت خیالیہ مدرکہ اس معنیٰ عقلی کے ادراک کے لیے معین و مددگار ثابت ہو۔

خداوند تعالےٰ نے انسان کی اس فطرت کا لحاظ فرماتے ہوئے اپنی عبادت کے لیے قبلہ متعین فرمایا اور اسے بمنزلہ دربارِ شاہی کے قرار دیا۔ پس نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرنا گویا دربارِ خداوندی میں حاضر ہونا ہے۔ اور قرأت و تسبیحات بمنزلہ مدح وثناء شاہی ہیں۔ اور رکوع وسجود وقیام وقعود خدمتِ شاہی میں مشغول ہونے کی مانند ہیں۔

۲ــــ شریعتِ الٰہیہ کا منشاء یہ ہے کہ مسلمانوں میں باہمی کامل اتحاد و اتفاق اور الفت و موافقت ہو۔ اور اس غرض کے لیے تمام مسلمانوں کے لیے ایک مرکز کا تعین ناگزیر تھا۔ اور قدرتی طور پر مسلمانوں کے لیے یہ مرکز بیت الحرام ہی قرار دیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ مکہ مکرمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت گاہ ہے۔ خانہ کعبہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد اور اوّلین عبادت خانہ ہے جس کو حضرت آدم اور پھر حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہم السلام نے اسی مقصد کے لیے تعمیر کیا تھا۔ پس یہ بالکل مناسب ہے کہ امتِ محمدیہ کے افراد اور ملتِ حنیفیہ کے پیروؤں کے لیے اسی کو قبلہ قرار دیا گیا۔

(از افادات امام رازیؒ) ماخوذ از قاموس القرآن صہ ۳۹۵

نیز تعیینِ قبلہ کے فلسفہ کو علامہ رشید رضا مصری نے اپنی تفسیر المنار صہ ۴۶۲/۴۶۳ ج اوّل میں اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ طالبِ تفصیل وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

ادب : وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتّٰى يُرٰى مَا تَحْتَ اِبْطَيْهِ مُضَامًّا كَفَّيْهِ جَاعِلًا بُطُوْنَهُمَا نَحْوَ السَّمَاءِ فَهُوَ مَرْوِيٌّ (عین العلم)

ترجمہ: اور آدابِ دعا سے ایک ہے کہ دعا کے وقت ہاتھوں کو باہم ملا کر اور ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف کر کے اس قدر اونچے کرے کہ بغلوں کے نیچے کا حصّہ دکھائی دینے لگے اور یہی (احادیث میں) مروی ہے۔

تشریح: یہ امر محقق ہے کہ دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا امر مسنون ہے۔ اس بارے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں۔

۱۔ مسلم شریف میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ عرفات میں تشریف لائے اور قبلہ رخ ہو کر آپ دعا کرتے رہے یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا۔

۲۔ اور حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں اپنے ہاتھ اس قدر بلند کرتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی معلوم ہونے لگتی تھی۔ (متفق علیہ)

۳۔ابو داؤد۔ترمذی وغیرہ میں حضرت سلمان رضؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حیّ اور سخی ہیں جب بندہ اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا تو اسے خالی اور نامراد واپس کرتے شرم آتی ہے۔

(زین الحلم شرح عین العلم ص ۱۰۲ ج ۱)

اور تعلیق الصبیح ص ۵۲ ج ۳ میں ہے کہ دعا کے اندر ہاتھ اٹھانے کی سنت اولین و آخرین سے جاری چلی آرہی ہے اور اس کا فلسفہ یہ ہے۔جب اللہ تعالےٰ کے حضور انتہائی عجز و ابتہال اور تضرع کا مظاہرہ کرنا دعا کے آداب میں سے ہے، تو پسندیدہ بات یہی ہے کہ اخلاص کے ساتھ قولاً و فعلاً اپنے عجز و انکسار کا اظہار کیا جائے۔چنانچہ اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا کرنا اور ساتھ ساتھ اپنی احتیاج و مسکنت کا اعتراف کرنا تضرع قولی ہے اور اس کے ساتھ اللہ کی جناب میں دست سوال دراز کرنا تضرع فعلی ہے اور ان دونوں کے جمع ہونے سے اجابتِ دعا کی امید زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔(انتہا)

اور ملا علی قاریؒ شرح اربعین ص ۸۶ پہ بیان فرماتے ہیں کہ بندے کا دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے سے بندہ کی ذات و عاجزی اور انکسار و افتقار کا عجیب مظاہرہ ہوتا ہے۔

ہاتھ اٹھانے کی ہیئت و کیفیت کا بیان

۱۔دعا میں ہاتھ کس قدر بلند کیے جائیں؟

دونوں ہاتھوں کو اس قدر اونچا کیا جائے کہ سینے یا کندھوں کے مقابل ہو جائیں اور سینے کے قریب ہوں، بلکہ سامنے کی سمت میں بڑھے ہوئے ہوں اور ہاتھوں کو اٹھانے کا یہی اوسط درجہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا کے وقت اکثر اپنے ہاتھوں کو اتنا ہی اٹھاتے تھے۔باقی جن احادیث سے ہاتھوں کو زیادہ اوپر اٹھانا معلوم ہوتا ہے، تو یہ صورت بعض اوقات پر محمول ہے۔یعنی جب دعا میں بہت ہی زیادہ استغراق، مبالغہ اور محویت منظور ہوتی تھی۔مثلاً استسقاء یا سخت آفات و مصائب کے وقت۔تو اس موقع پر اپنے ہاتھوں کو اتنے اٹھاتے تھے کہ بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔چنانچہ علامہ طحطاوی حاشیہ مراقی ص ۳۷۰ پہ فرماتے ہیں: وَفِي الْحِصْنِ الْحَصِيْنِ وَشَرْحِهٖ اَنْ يَّرْفَعَهُمَا حِذَاءَ مَنْكِبَيْهِ بَاسِطًا كَفَّيْهِ نَحْوَ السَّمَاءِ لِاَنَّهَا قِبْلَةُ الدُّعَاءِ اھ وَاَمَّا مَا رُوِيَ اَنَّهٗ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ اِبْطَيْهِ فَمَحْمُوْلٌ عَلٰى بَيَانِ الْجَوَازِ اَوْ عَلٰى حَالَةِ الْاِسْتِسْقَاءِ وَنَحْوِهَا مِنْ شِدَّةِ الْبَلَاءِ وَالْمُبَالَغَةِ فِي الدُّعَاءِ۔

اور اسی مقام پر علامہ طحطاوی بعض افاضل سے نقل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہاتھوں کو خواہ سینے تک اٹھایا جائے یا کندھوں تک دونوں صورتیں جائز ہیں اور ان میں معمولی تفاوت ہے۔ باقی علما نے لکھا ہے کہ جس مقصد و مراد کے لیے دعا مانگی جارہی ہو وہ مقصد جتنا زیادہ اہم ہو۔ دعا کے وقت دونوں ہاتھ بھی اتنے ہی زیادہ اوپر اٹھانے چاہئیں:

(تعلیق الصبیح ص ۵۲ ج ۳)

۲۔ کیا دعا کے وقت دونوں ہاتھوں کو باہم ملایا جائے یا کشادہ رکھا جائے؟

علامہ طحطاوی۔ نہر الفائق کے حوالے سے لکھتے ہیں: وَفِی النَّهْرِ مِنْ كَيْفِيَّةِ الْمُسْتَحَبَّةِ اَنْ يَّكُوْنَ بَيْنَ الْكَفَّيْنِ فُرْجَةٌ وَاِنْ قَلَّتْ۔ یعنی ہاتھ اٹھانے کی مستحب کیفیت یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کے درمیان کشادگی کسی قدر ہونی چاہیئے خواہ قلیل ہی کیوں نہ ہو۔

اور اس کے آگے علامہ موصوف حصن حصین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ دعا کے آداب سے ایک یہ بھی ہے کہ دونوں ہاتھوں کو باہم ملایا جائے اور انگلیوں کا رخ بجانب قبلہ ہونا چاہیئے۔ وَفِی شَرْحِ الْحِصْنِ وَالظَّاهِرُ اَنَّ مِنَ الْاٰدَابِ اَيْضًا ضَمُّ الْيَدَيْنِ وَتَوْجِيْهُ اَصَابِعِهُمَا نَحْوَ الْقِبْلَةِ۔

اور آگے فرماتے ہیں کہ ہاتھوں کا باہم ملانا افضل اور بہتر ہے اور اگر معمولی کشادگی رکھی جائے تو بھی جائز ہے۔

اور امام شعرانی لواقح الانوار ص ۲۹ پر فرماتے ہیں۔ آسمان کی طرف دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے میں حکمت یہ ہے کہ دربارِ خداوندی سے معنوی عطیات حاصل کرنے کے لیے ہاتھ ایک ذریعہ ہیں۔ پس دونوں ہاتھوں کو باہم اس قدر ضم کیا جائے۔ جس طرح پانی پینے والا اپنے دونوں ہاتھوں کو باہم ملاتا ہے۔

۳۔ کیا ہاتھ اٹھانے وقت ہتھیلیوں کا رُخ اپنے منہ کی طرف ہونا چاہیئے۔ یا آسمان کی طرف؟

دعا کے وقت ہاتھ اٹھاتے ہوئے ہتھیلیوں کا رُخ آسمان کی طرف ہونا چاہیے اور ایک روایت میں جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا مانگتے تھے تو دونوں ہتھیلیاں ملا لیتے تھے اور ان کا رُخ اپنے منہ کی طرف رکھتے تھے۔ (زین الحلم ص ۱۰۲ ج ۱)

تو اس کے متعلق ملا علی قاریؒ شرح اربعین نوویہ ص ۸۶، ۸۷ پر لکھتے ہیں کہ جَاءَ اَيْضًا اَنَّهٗ رَفَعَ يَدَيْهِ وَجَعَلَ ظُهُوْرَهُمَا اِلٰى جِهَةِ الْقِبْلَةِ وَجَعَلَ بُطُوْنَهُمَا مِمَّا يَلِيْهِ لَعَلَّهٗ لِبَيَانِ الْجَوَازِ

تو آپ نے اس طرح بیان جواز کے لیے کیا ہے۔

شبہ۔ دعا کے وقت آسمان کی طرف ہاتھ اٹھانے میں کیا حکمت ہے جب کہ اللہ تعالیٰ جہت سے منزہ ہیں۔

جواب:۱۔ یہ امر تعبدی ہے یعنی سرکاری حکم کی تعمیل ہے۔ جس طرح نماز کے اندر قبلہ رخ ہونا اور سجدہ کی حالت میں ناک اور پیشانی کا زمین پر رکھنا امر تعبدی ہے اور آسمان دعا کے لیے بمنزلہ قبلہ ہے۔

جواب۔۲۔ نیز جہت سماوی کو کئی وجوہ سے فضیلت حاصل ہے۔ آسمان ہی مہبط رزق رحمت و برکت یعنی مہبط نزول باراں ہے اور اسی سے وحی نازل ہوتی رہی اور وہی ملاء الاعلیٰ کا مسکن ہے اور وہاں ہی بندوں کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں اور اسی میں جنت ہے جو مومن کی انتہائی مراد ہے اور دعا کے لیے بمنزلہ قبلہ کے ہے۔ (تعلیق الصبیح ملخصاً ص ۵۲ ج ۳)

مسئلہ۔۴۔ کیا دعا سیدھے ہاتھوں سے کرنی چاہیے یا الٹے ہاتھ بھی کرنی جائز ہے۔

دعا مانگتے وقت جب ہاتھوں کو اٹھاؤ تو ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف کرو جیسا کہ دعا کے وقت کا معمول ہے۔ ہاتھوں کو الٹ کر دعا نہ مانگو۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے۔ سَلُوا اللّٰہَ بِبُطُونِ اَکُفِّکُمْ وَلَا تَسْئَلُوْہُ بِظُھُوْرِھَا فَاِذَا فَرَغْتُمْ فَامْسَحُوا بِھَا وُجُوْھَکُمْ۔ وَاَمَّا مَا وَرَدَ فِی صَحِیْحِ الْمُسْلِمِ اَنَّہٗ عَلَیْہِ السَّلَام جَعَلَ ظُھُوْرَھُمَا اِلَی السَّمَاءِ فَلَعَلَّہٗ مِنْ خُصُوْصِیَّۃِ دُعَاءِ الْاِسْتِسْقَاءِ لِمَا فِیْہِ مِنَ الْاِیْمَاءِ اِلٰی اِنْقِلَابِ الْاَحْوَالِ کَمَا ذُکِرَ فِی تَقْلِیْبِ الرِّدَاءِ فَالْاَوَّلُ لِحُصُوْلِ مَطْلُوْبٍ مِنَ النَّعْمَاءِ وَالثَّانِیْ لِدَفْعِ مَا وَقَعَ بِہٖ مِنَ الْبَلَاءِ (شرح اربعین للقاری ص ۸۶)

ترجمہ۔ جس وقت تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو تو اس سے اپنے سیدھے ہاتھوں کے ذریعے مانگو۔ اور جب تم فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھوں کو اپنے منہ پر پھیر لو اور وہ حدیث جو مسلم شریف میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعا مانگی تو ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کر لی، تو ہو سکتا ہے کہ یہ طلب بارش کی دعا کی خصوصیات سے ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک اچھا شگون اور فال لینے کی درجہ میں ہے اور اس میں تبدیلی حالات کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ چادر پلٹ کر اچھا شگون لیا جاتا ہے۔ پس اگر کسی نعمت کی طلب کے لیے دعا کی جائے تو ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف کرنا چاہیے اور اگر کسی بلاء (قحط وغیرہ) کے دور کرنے کے لیے دعا مانگی جائے تو ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کرنا چاہیے۔

دعاء کے اقسام اور ہاتھ اٹھانے کی کیفیت

مبسوط سرخسی میں امام محمدؒ بن حنفیہ سے منقول ہے کہ دعا کی چار قسمیں ہیں۔

دعائے رغبت ۔ ۱ ۔ اس میں بطنِ کف آسمان کی طرف ہوں ۔

دعائے رہبت ۔ ۲ ۔ اس میں پشتِ دست اپنے چہرے کی طرف ہوں ۔

دعائے تضرع ۔ ۳ ۔ اس میں خنصر و بنصر دونوں انگلیوں کو بند کرے اور وسطی اور ابہام کا حلقہ بنائے اور مسبحہ سے اشارہ کرے ۔

دعائے خفیہ ۔ ۴ ۔ کہ بندہ صرف دل سے عرض کرے اور زبان نہ ہلائے ۔ (مراقی مع الطحطاوی ص ۲۰۶)

۵ - دعا کے بعد دونوں ہاتھوں کا چہرے پر پھیر لینا بھی امر مسنون ہے چنانچہ حضرت سائب ابن یزید اپنے والدِ مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا مانگتے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے تو اپنے منہ پر دونوں ہاتھوں کو پھیرتے تھے ۔ (بیہقی)

اور حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ رسولِ خدا جب دعا میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے تو انہیں اس وقت تک نہ رکھتے تھے جب تک اپنے منہ پر نہ پھیر لیتے تھے ۔ (ترمذی)

اور تعلیق الصبیح ص ۵۲ ج ۳ پر اس کا یہ فلسفہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ وَاَمَّا مَسْحُ الْوَجْهِ بِهِمَا فِیْ خَاتِمَةِ الدُّعَاءِ فَنَرَاهُ مِنْ طَرِیْقِ التَّیَمُّنِ وَالتَّفَاؤُلِ فَکَاَنَّهٗ یُشِیْرُ اِلٰی اَنَّ کَفَّیْهِ مُلِئَتَا الْبَرَکَاتِ السَّمَاوِیَّةِ وَالْاَنْوَارِ الْاِلٰهِیَّةِ فَهُوَ یُفِیْضُ مِنْهَا عَلٰی وَجْهِهِ الَّذِیْ هُوَ اَوْلَی الْاَعْضَاءِ بِالْکَرَامَةِ

ترجمہ : دعا کے خاتمہ پر اپنے دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنا بطورِ تیمن اور نیک فالی کے ہے اور گویا وہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ میری ہتھیلیاں برکاتِ سماویہ اور انوارِ الٰہیہ سے مملو ہو چکی ہیں اور وہ اشرف الاعضاء یعنی اپنے چہرے کو ان سے مستفیض کر رہا ہے ۔ (ہکذا فی تحفۃ الاحوذی ص ۳۲۹ ج ۹)

مسئلہ ۔ ایک ہاتھ کا چہرے پر پھیرنا متکبرین کا فعل ہے ۔ ولا یمسح بیدٍ واحدۃٍ لانہ فعل المتکبرین (طحطاوی)

۶ ۔ باقی دعاؤں کے بارے میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے اسی جگہ سنت ہیں ۔ جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہاتھ اٹھانے ثابت ہیں اور جس مقام پر ہاتھ اٹھانے ثابت نہیں ، وہاں بغیر ہاتھ اٹھائے دعا کرنا سنت ہے اور ایسے موقعہ پر ہاتھ اٹھانا خلافِ سنت اور مکروہ ہے ۔ اس موقع پر طحطاوی ص ۲۰۴ میں تفصیل ملاحظہ فرمائیں ۔

اور شرحِ مناسک میں ملا علی قاری لکھتے ہیں۔ اَلسُّنَّۃُ مُتَّبَعَۃٌ فِی الْاَحْوَالِ الْمُخْتَلِفَۃِ اَمَا تَرٰی اَنَّہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ دَعٰی فِی الطَّوَافِ وَلَمْ یَرْفَعْ یَدَیْہِ

ترجمہ: سنت کی مختلف حالات میں پیروی کی جائے گی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حضور علیہ السلام نے طواف میں دعا مانگی اور ہاتھ نہیں اٹھائے۔

تفسیر روح البیان صـ۳۲۶ ج ۴ میں علامہ اسماعیل حقی افندیؒ نقل فرماتے ہیں کہ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں۔ کہ ایک رات کو میں نے سخت سردی کی وجہ سے ایک ہی ہاتھ کو نکال کر دعا مانگی۔ دعا سے فراغت کے تھوڑی دیر بعد مجھ پر اونگھ طاری ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرا وہ ہاتھ جو دعا کے لیے نکالا تھا نور سے بھرا ہوا ہے اور دوسرا بالکل خالی۔ تو میں نے کہا اے میرے پروردگار! اس کی کیا وجہ ہے تو غیب سے آواز آئی کہ جس ہاتھ کو تو نے دعا کے لیے نکالا تھا وہ تو نور سے بھر دیا گیا ہے اور جس ہاتھ کو تو نے مستور رکھا وہ محروم کر دیا گیا۔

ادب : دُوْنَ الْعَیْنِ فَھُوَ مَنْھِیٌّ عَنْہُ ۔ (عین العلم)

ترجمہ: (اور آداب دعا سے ایک یہ ہے) کہ دعا کے وقت اپنی نگاہ آسمان کی طرف نہ اٹھائے، کیونکہ بوقتِ دُعا نگاہ کا بلند کرنا ممنوع ہے۔

تشریح: زین الحلم شرح عین العلم صـ۱۰۲ ج ۱ میں ملا علی قاریؒ اس قول کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَیَنْتَھِیَنَّ اَقْوَامٌ عَنْ رَفْعِ اَبْصَارِھِمْ اِلَی السَّمَاءِ عِنْدَ الدُّعَاءِ اَوْ لَتُخْطَفَنَّ اَبْصَارُھُمْ۔ ترجمہ: لوگ اپنی نگاہیں آسمان کی طرف بوقتِ دُعا اٹھانے سے باز آجائیں، ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔

اور علامہ طحطاوی صـ۱۷۳ پر فرماتے ہیں: وَیُکْرَہُ اَنْ یَرْفَعَ بَصَرَہٗ اِلَی السَّمَاءِ لِمَا مِنْ تَرْکِ الْاَدَبِ وَلِوَھْمِ الْجِھَۃِ وَقَدْ نَھَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ السَّلَامُ عَنْ ذَالِکَ۔ کَمَا فِی شَرْحِ الْحِصْنِ الْحَصِیْنِ

ترجمہ: دعا کے وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھانا مکروہ ہے۔ اس لیے کہ ایک تو اس میں ترکِ ادب ہے اور نیز اس میں اللہ تعالےٰ کے لیے ایک جہت کی تعیین کا ایہام بھی لازم آتا ہے اور جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بوقتِ دعا آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے کو منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ حصن حصین کی شرح میں مذکور ہے۔

کمالِ انسانی کے راز

حضرت مولانا

مفتی جمیل احمد صاحب

تھانوی

کنز العمال میں ہے کہ حضرت شیخ جلال الدین سیوطی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ شمس الدین بن القماح کے ایک مجموعہ احادیث میں جو ان کے استاذ ابوالعباس مستغفری کی روایات کا مجموعہ تھا، خود ان کے قلم سے لکھا ہوا پایا ہے کہ میں امام ابوحامد مصری سے علم حاصل کرنے کی طلب میں مصر حاضر ہوا اور میں نے ان سے حضرت خالد بن ولیدؓ کی حدیث دریافت کی تو مجھے ایک سال بھر کے روزے رکھنے کا حکم دیا۔ تعمیل کے بعد پھر حاضر ہوا تو انہوں نے حضرۃ خالد بن ولیدؓ تک اپنے استادوں کی سند سے مجھے یہ حدیث سنائی فرمایا:

جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ سَائِلُكَ عَمَّا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَقَالَ لَهٗ سَلْ عَمَّا بَدَا لَكَ، قَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اُحِبُّ اَنْ اَكُوْنَ اَعْلَمَ النَّاسِ قَالَ اتَّقِ اللّٰهَ تَكُنْ اَعْلَمَ النَّاسِ۔

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کیا میں آپ سے دُنیا و آخرت کی باتیں دریافت کرتا ہوں، فرمایا جو جی چاہے پوچھو۔ عرض کیا یا نبی اللہ میں چاہتا ہوں کہ سب لوگوں سے بڑا عالم ہو جاؤں۔ فرمایا خدا تعالےٰ سے ڈرا کرو اور ہر حکم پر عمل کرو تم سب سے بڑے عالم ہو جاؤ گے۔

فَقَالَ اُحِبُّ اَنْ اَكُوْنَ اَغْنَى النَّاسِ قَالَ كُنْ قَانِعًا تَكُنْ اَغْنَى النَّاسِ۔ قَالَ اُحِبُّ اَنْ اَكُوْنَ خَيْرَ النَّاسِ۔ فَقَالَ خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ فَكُنْ نَّافِعًا لَّهُمْ۔ فَقَالَ اُحِبُّ اَنْ اَكُوْنَ اَعْدَلَ النَّاسِ قَالَ اَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ تَكُنْ اَعْدَلَ النَّاسِ۔ قَالَ اُحِبُّ اَنْ اَكُوْنَ اَخَصَّ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى۔ قَالَ اَكْثِرْ ذِكْرَ اللّٰهِ تَكُنْ اَخَصَّ الْعِبَادِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى قَالَ اُحِبُّ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ قَالَ

عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ سب آدمیوں سے زیادہ غنی ہو جاؤں۔ فرمایا قناعت کرو سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں سب سے زیادہ خیر والا ہو جاؤں۔ فرمایا سب لوگوں سے خیر والا وہ ہے جو سب کو نفع پہنچائے۔ تو تم سب کو فائدہ پہنچانے والے بنو۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ سب سے زیادہ عدل و انصاف والا ہو جاؤں۔ فرمایا تم سب لوگوں کے لیے وہ پسند کیا کرو۔ جو اپنے لیے پسند کرتے ہو تم سب سے زیادہ عدل و انصاف والے ہو جاؤ گے۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے بڑھ کر خاص بندوں میں ہو جاؤں۔ فرمایا اللہ کا ذکر بہت زیادہ کرو تم اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے بڑھکر خاص بندے ہو جاؤ گے عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ بہترین عبادت گزاروں میں سے ہو جاؤں۔

اُعْبُدِ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ . قَالَ اُحِبُّ اَنْ یَّکْمُلَ اِیْمَانِیْ فَقَالَ حَسِّنْ خُلُقَکَ یَکْمُلْ اِیْمَانُکَ فَقَالَ اُحِبُّ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُطِیْعِیْنَ قَالَ اَدِّ فَرَائِضَ اللّٰہِ تَکُنْ مُطِیْعًا . فَقَالَ اُحِبُّ اَنْ اَلْقَی اللّٰہَ نَقِیًّا مِّنَ الذُّنُوْبِ ، قَالَ اغْتَسِلْ مِنَ الْجَنَابَۃِ مُتَطَھِّرًا تَلْقَ اللّٰہَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَمَا عَلَیْکَ ذَنْبٌ . فَقَالَ اُحِبُّ اَنْ اُحْشَرَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فِی النُّوْرِ قَالَ لَا تَظْلِمْ اَحَدًا تُحْشَرْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فِی النُّوْرِ . قَالَ اُحِبُّ اَنْ یَّرْحَمَنِیْ رَبِّیْ ، قَالَ ارْحَمْ نَفْسَکَ وَارْحَمْ خَلْقَ اللّٰہِ یَرْحَمْکَ اللّٰہُ .

قَالَ اُحِبُّ اَنْ تَقِلَّ ذُنُوْبِیْ قَالَ اسْتَغْفِرِ اللّٰہَ تَقِلَّ ذُنُوْبُکَ . قَالَ اُحِبُّ اَنْ اَکُوْنَ اَکْرَمَ النَّاسِ قَالَ لَا تَشْکُوَنَّ اللّٰہَ اِلَی الْخَلْقِ تَکُنْ اَکْرَمَ النَّاسِ ، فَقَالَ اُحِبُّ اَنْ یُّوَسَّعَ عَلَیَّ فِی الرِّزْقِ قَالَ دُمْ عَلَی الطَّھَارَۃِ یُوَسَّعْ عَلَیْکَ فِی الرِّزْقِ قَالَ اُحِبُّ اَنْ اَکُوْنَ مِنْ اَحِبَّاءِ

فرمایا اللہ کی عبادت ایسے کیا کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ تم اگر نہیں دیکھ سکتے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہے ہیں۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ میرا ایمان مکمل ہو جائے۔ فرمایا اپنے اخلاق کو عمدہ کرلو تمہارا ایمان مکمل ہو جائیگا۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے فرمانبرداروں میں ہو جاؤں، فرمایا اللہ تعالیٰ کی تمام فرض کی ہوئی باتوں کو ادا کیا کرو فرمانبردار ہو جاؤگے۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پاک صاف ہو کر حاضر ہوں۔ فرمایا جنابت کے بعد غسل خوب صفائی سے کیا کرو تم قیامت میں اللہ تعالےٰ کے یہاں اس طرح حاضر ہوگے کہ تم پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن نور میں لپٹ کر حاضر کیا جاؤں۔ فرمایا تم کسی پر ظلم نہ کرنا، قیامت کے دن نور میں محشور ہوگے۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ میرا رب مجھ پر رحم فرمائے۔ فرمایا اپنی ذات پر رحم کیا کرو اور اللہ کی کل مخلوق پر رحم کیا کرو اللہ تم پر رحم کریں گے۔

عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ میرے گناہ کم ہو جائیں۔ فرمایا اللہ سے گناہوں کی مغفرت مانگا کرو، تمہارے گناہ کم ہو جائیں گے عرض کیا۔ میں چاہتا ہوں سب لوگوں سے بڑا بزرگ ہو جاؤں۔ فرمایا تم اللہ کی شکایت مخلوقات کے سامنے نہ کیا کرو۔ تم سب سے بڑے بزرگ ہو جاؤگے۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ مجھ پر رزق میں کشائش کردی جائے۔ فرمایا ہمیشہ وضو سے رہو رزق میں کشائش کردی جائے گی۔ عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے دوستوں میں ہو جاؤں، فرمایا تم

اللهِ وَرَسُولِهِ، قَالَ أَحِبَّ مَا أَحَبَّ اللهُ وَرَسُولُهُ وَأَبْغِضْ مَا أَبْغَضَ اللهُ وَرَسُولُهُ قَالَ أُحِبُّ أَنْ أَكُونَ آمِنًا مِّنْ سَخَطِ اللهِ، قَالَ لَا تَغْضَبْ عَلٰى أَحَدٍ تَأْمَنْ غَضَبَ اللهِ وَسَخَطَهُ، قَالَ أُحِبُّ أَنْ تُسْتَجَابَ دَعْوَتِيْ قَالَ اجْتَنِبِ الْحَرَامَ تُسْتَجَبْ دَعْوَتُكَ، قَالَ أُحِبُّ أَنْ لَّا يَفْضَحَنِيَ اللهُ عَلٰى رُءُوْسِ الْأَشْهَادِ قَالَ اِحْفَظْ فَرْجَكَ كَيْلَا تَفْتَضِحَ عَلٰى رُءُوْسِ الْأَشْهَادِ۔

قَالَ أُحِبُّ أَنْ يَّسْتُرَ اللهُ عَلَيَّ عُيُوْبِيْ، قَالَ اسْتُرْ عُيُوْبَ إِخْوَانِكَ يَسْتُرِ اللهُ عَلَيْكَ عُيُوْبَكَ، قَالَ مَا الَّذِيْ يَمْحُوْ عَنِّي الْخَطَايَا قَالَ الدُّمُوْعُ وَالْخُضُوْعُ وَالْأَمْرَاضُ، قَالَ أَيُّ حَسَنَةٍ أَفْضَلُ عِنْدَ اللهِ قَالَ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالتَّوَاضُعُ وَالصَّبْرُ عَلَى الْبَلِيَّةِ وَالرِّضَاءُ ضَناءِ قَالَ أَيُّ سَيِّئَةٍ أَعْظَمُ عِنْدَ اللهِ قَالَ سُوْءُ الْخُلُقِ وَالشُّحُّ الْمُطَاعُ، قَالَ مَا الَّذِيْ يُسَكِّنُ غَضَبَ الرَّحْمٰنِ قَالَ إِخْفَاءُ الصَّدَقَةِ وَصِلَةُ الرَّحِمِ۔ قَالَ مَا الَّذِيْ يُطْفِئُ نَارَ جَهَنَّمَ قَالَ الصَّوْمُ۔

دوست رکھو ہر اس چیز کو جس کو اللہ اور اس کے رسول نے دوست رکھا ہے اور بغض رکھو ہر اس سے جس سے اللہ و رسول نے بغض رکھا ہے۔

عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے غصہ سے مامون ہو جاؤں۔ فرمایا تم کسی پر (بیجا) غصہ نہ کرو۔ اللہ کے غصہ اور غضب سے مامون رہو گے۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ میری دُعائیں قبول کی جائیں۔ فرمایا حرام سے بچ جاؤ۔ تمہاری دعائیں قبول ہوا کریں گی۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے سامنے مجھے رسوا نہ کریں قیامت کے دن۔ فرمایا اپنی شرمگاہ کو روک رکھو تاکہ تم سب لوگوں کے سامنے رسوا نہ ہو۔ عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے عیب چھپالیں فرمایا تم اپنے بھائیوں کے عیبوں کو چھپاؤ اللہ تمہارے عیبوں کو چھپالیں گے۔ عرض کیا وہ کیا چیز ہے جو مجھ سے خطائیں مٹادے۔ فرمایا۔ آنسو۔ عاجزی اور بیماریاں۔ عرض کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کونسی نیکی سب سے افضل ہے. فرمایا اچھی عادت، تواضع، مصائب پر صبر اور ہر حکم الٰہی پر راضی رہنا،

عرض کیا اللہ کے نزدیک کون سا بڑا گناہ ہے۔

فرمایا بری عادت اور بخیلی جس پر عمل کیا جائے۔

عرض کیا وہ کیا چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے غصہ کو روک دے۔

فرمایا چھپا کر خیرات کرنا اور قرابت داروں سے سلوک کرنا۔

عرض کیا وہ کیا چیز ہے جو دوزخ کی آگ کو بجھا دے ❁

بقیہ صفحہ ۵۰

محترم الحاج محمود احمد عارف

نعت

گنبدِ خضرا کے نظّارے دیکھ کے جاگے بھاگ ہمارے
اللہ اللہ ان کی بستی ! بہتے ہیں رحمت کے دھارے
ختم ہوئی ہے اُن پہ نبوّت وہ نبیوں کے راج دلارے
قربِ خدا ہے ان کا تقرب مانیں اہلِ حکمت سارے
افضل ، اجمل ، اکمل ، اکرم دو جگ کے مَن موہن پیارے
ان کو وُہ معراج ملی ہے رَہ گئے خاکی نوری سارے
ان کے ہی فیضان کے صدقے روشن ہیں یہ چاند ستارے
دور ہوئی سب ظلمت عصیاں پھوٹ پڑے جب نور کے دھارے
بدو عرب کے ظالم و جاہل رہبر صدق بنے سچیارے

عارفؔ اس کی قسمت جاگی
بیٹھ گیا جو ان کے دوارے

حضرت سیّد انور حسین نفیسؔ خلیفۂ مجاز حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائپوریؒ

قارئین کرام کی خدمت میں "انوار العاشقین" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ انوار العاشقین بزرگانِ سلسلہ چشتیہ صابریہ کا ایک تذکرہ ہے۔ اس کے مؤلف مولانا مشتاق احمد صاحب انبٹھوی صابری مرحوم و مغفور ہیں۔ سن تالیف ۱۳۳۱ ہجری ہے۔ ۱۳۳۲ھ میں مجلسِ اشاعۃ العلوم حیدر آباد دکن کے اہتمام سے عثمان پریس حیدر آباد دکن میں طبع ہوا۔

فاضل مؤلف نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے یہ تذکرہ "حسب الحکم مولانا مولوی حاجی حافظ محمد انوار اللہ خاں بہادر معین المہام امور مذہبی ممالک محروسۂ سرکار آصفیہ" مرتب کیا۔ حضرت مولانا انوار اللہ خاں صاحب کو انہوں نے "خلیفۂ خاص شیخ المشائخ قطبِ زمان خود حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر چشتی صابری مکی نور اللہ مضجعہ" لکھا ہے۔

فاضل مؤلف سلسلہ چشتیہ صابریہ کے صاحب نسبت بزرگ تھے۔ انہیں حضرت حافظ محمد صابر علی رام پوری رحمتہ اللہ علیہ سے ارادت و خلافت تھی۔ سلسلۂ طریقت حسبِ ذیل ہے:۔ (م ۱۳۱۶ھ)

حضرت مولانا مشتاق احمد انبٹھوی از حضرت حافظ محمد صابر علیؒ رام پوری از حضرت میاں جی کریم بخش رام پوری از حضرت مولانا محمد حسن محدّث عرف مولانا محمد بخش رام پوریؒ از حضرت شیخ امام علی رام پوریؒ از حضرت سید شاہ امیر الدین شاہ آبادی از حضرت مولانا سید غلام علی شاہ مرشد آبادی از حضرت شاہ محمد حیات سلیمانوی از حضرت شاہ محمد جمال محبوب الٰہی رنبوی از حضرت شیخ محمد اعظم جی رنبویؒ از حضرت شاہ غریب اللہ اختیار پوری از حضرت شیخ محمدؐ جی گنگوہی از حضرت شیخ محمد صادق گنگوہی از حضرت شاہ ابو سعید گنگوہیؒ از حضرت شیخ نظام الدین تھانیسری از حضرت جلال الدین تھانیسری از حضرت قطب الدین شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

فاضل مؤلف اپنے مشائخ کے علاوہ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی (م ۱۳۱۰ھ) سے بھی

غایت درجہ حُسنِ عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے خلفاء کرام خصوصاً بزرگانِ دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ کا تذکرہ بھی انہوں نے بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ ذیل کا اقتباس انہیں جذباتِ محبت و عقیدت کا آئینہ دار ہے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء بے شمار ہر دیار و امصار میں ہیں۔ متاخرین چشتیہ صابریہ (باوجود قیام مکہ معظمہ کے کہ وہاں حاضر ہو کر شہرت کا ہونا نادر ہے) حضرت ممدوح کے برابر مشائخ میں سے کسی کو اس درجہ شہرت نہیں ہوئی منجملہ آپ کے خلفاء کے حضرت[1] بقیۃ السلف حجۃ الخلف مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ مُسلّم علماء اور صُلحائے گزرے ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء بھی آج کل مقدس بزرگ اور عالم باعمل مانے جاتے ہیں۔ جیسے مولانا حضرت[2] محمود حسن صاحب دیوبندی صدر مدرس مدرسہ عالیہ دیوبند اور حضرت[3] مولانا خلیل احمد صاحب انبہٹوی صدر مدرس مدرسۂ عالیہ سہارن پور، حضرت[4] مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے صاحبزادے مولانا حکیم مسعود احمد صاحب خاص گنگوہ میں مولانا کے جانشین اور اوقات کے پابند ہیں۔ راقم الحروف ان سے مل کر خوش ہوتا ہے اور جس طرح حضرت مولانا رشید احمد صاحب عاجز کے ساتھ نوازش و کرم سے پیش آتے تھے، اسی طرح حکیم صاحب کمال شفقت اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ یہ حضرات تو مولانا کے خلفاء ہیں۔ مگر جناب مولوی شاہ ظہور احمد صاحب انبہٹوی کو جو نسبت خاص روحِ مقدس حضرت مولانا سے یہ عاجز راقم الحروف پاتا ہے وہ فنافی الشیخ کے درجہ سے کم نہیں۔ لہٰذا یہ بدرجۂ اولیٰ خلافت کے لائق ہیں۔ بارک اللہ فی عمرہم وصلاحہم۔ حاجی وارث حسن صاحب بھی حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے عمدہ خلفاء میں ہیں اور مشائخانہ طریقہ اور لباس صوفیانہ رکھتے ہیں۔ حضرت[5] مکرمی مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علومِ ظاہری اور باطنی کے جامع، اس وقت عمدہ خلفائے حاجی صاحب سے ہیں۔ وعظِ مولانا اشرف علی صاحب سے عالم و جاہل دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ روایاتِ صحیحہ اور مضامین عالیہ نہایت آسان عبارت میں بیان فرماتے ہیں۔ بڑے قادر الکلام ہیں۔ زبردست مصنف ہیں۔ صدہا کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تمام عمر میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے بوجہ کسر نفسی اور کمالِ تواضع کے کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ بیعت بھی حضرت قبلۂ عالم حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے نیابتاً کرتے تھے۔ حضرت

---

[1] وفات ۱۳۲۳ھ [2] وفات ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ [3] وفات ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ [4] وفات ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ
[5] وفات ۱۳۶۲ھ

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عشق اور محبت میں فنا تھے۔ کمالاتِ امدادیہ میں نقل کیا ہے کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان عطا فرماتا ہے، چنانچہ حضرت شمس تبریزؒ کے واسطے مولانا رومیؒ کو لسان بنایا تھا اور مجھ کو مولانا محمد قاسم لسان عطا ہوئے ہیں اور جو میرے قلب میں آتا ہے، مولوی صاحب اس کو بیان کر دیتے ہیں، ہیں بعض اصطلاحات نہ جاننے سے اس کا بیان نہیں کر سکتا۔"

عاجز راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں یہ عاجز ایک دفعہ حضرت مخدوم العالمین خواجہ سید مخدوم علاء الدین علی احمد صابر رضی اللہ عنہ کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوا تو اس وقت حضور مخدوم مولانا محمد قاسم کی صورت میں نظر آئے اور حضرت عارف باللہ شیخی توکل شاہ صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے عاجز سے فرمایا تھا کہ میں نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ حضور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے جا رہے ہیں۔ مولانا محمد قاسمؒ تو جہاں پائے مبارک حضور کا پڑتا ہے وہاں دیکھ کر پاؤں رکھتے ہیں اور میں بے اختیار بھاگا ہوں کہ حضور کے پاس پہنچوں، چنانچہ میں آگے ہو گیا۔"

("انوار العاشقین" صفحہ ۸۶ تا ۸۸)

"انوارِ مدینہ" میں

اشتہار

دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

ہمارے یہاں ٹیکسٹائل ملز کے سپیئر مارپٹ اور ہر قسم کے سپرنگ تیار ہوتے ہیں

پاکستان سپرنگ مینوفیکچرنگ کمپنی

برانڈرتھ روڈ، رام گلی نمبر ۱، لاہور: فون 66065

مَاكَانَ مُحَمَّدٌ
اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ
وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ
الاحزاب
کتبہ نفیس

رثاء

شیخ المشائخ امام المعقول
مولانا محمد رسول خان رحمۃ اللہ علیہ
شیخ الحدیث بالجامعۃ الاشرفیۃ لاہور

بقلم الاستاذ العلام محمد موسیٰ الروحانی البازی المدرس بالجامعۃ الاشرفیۃ بلاہور

قِفا وَ انْدُبَا اطلالَ دُورِ الاحِبّۃِ ۔۔۔ وقد اَقْفرتْ دھرًا لِرحلۃ رُحلۃِ
رُسُومًا "باجریّان" ولاھور طالما ۔۔۔ شَرِبنا بھارَیًا کؤوسَ المحبۃِ
قِفِی، ناقتی فی "اجریان" ساعۃً نَزُرْ ۔۔۔ قبُورًا و فیھا قبرُ شیخِ المشیخۃِ
ضریحُ رسُولِ خانَ روضٌ منوّرٌ ۔۔۔ وقد غاب نجمُ العلمِ فی روضِ جنّۃِ
اجلّ الرزایا اَنْ یموت محدّث ۔۔۔ کشیخی رسولِ خانَ صاحب عظمۃِ
ولو طفت کلّ الارض لم تر مثلہ ۔۔۔ حکیمًا کریمًا ذا ودادٍ و ھیبۃِ
فمالک یا قلبی تجُوشُ من الشّجا ۔۔۔ وَقد کنتَ مشھورًا بشِدّۃ قسوۃِ
نعم کنتُ اعتقتُ العیون من البکا ۔۔۔ وقد ردہ حُزنی علیکم و شجوتی
تَملّکَ اَجفانِی سھادٌ و جانبِی ۔۔۔ نأی من فراش نفرۃً بعد کربۃِ
رحلتم فکم من اَنّۃٍ بعد حنّۃٍ ۔۔۔ مُبیّنۃٍ فی الارض حزن البریّۃِ
حیارٰی غَشتْہم صاعقاتٌ و صیّبٌ ۔۔۔ و رعدٌ و برقٌ ظلمۃٌ فوق ظلمۃِ
فاِنّ لدنیا لا یدوم نعیمُھا ۔۔۔ ولا تؤمنن یومًا فجائع سطوۃِ
وتضحِکُ طورًا ثم تُبکیک تارۃً ۔۔۔ تُقلّبنا ظھرًا لبطنٍ کریشۃِ

فمن لاحادیث النّبی یُلینُها — اِلانةَ داوٗدَ الحدیدَ بِسُرعةٍ
ومن لاشارات ابن سینا یحلّها — ویظهر فیها نکتةٌ بعد نکتةٍ
ومن لعطاش العلم یسقیهم کما — سَقی المُزْنُ اَرضًا میتةً بعد جَدبةٍ
ومن للحیاریٰ کالحباریٰ یَدُلُّهم — سبیلَ الکرامِ السالفین بحجّةٍ
ومن لاحادیث الرسول یذیعها — اذاعةَ شمسٍ نُورَها بعد دُجیةٍ
فدرَّسها دهرًا مدیدًا فاصبحت — تشعشع منها النّور فی کل خطةٍ
ومن ذاالذی لم یستفد من ضیائه — ولکنْ قلیلٌ من یریٰ شکر نعمةٍ
سما بشعارِ الصّالحین وهَدْیِهم — واعلیٰ رسُومَ الدین فی کلّ جلوةٍ
له سیرةٌ مرضیةٌ و سریرةٌ — تضیئُ بنور المصطفیٰ نور سنةٍ
فجودك موجود و فضلك فائض — وعلمك للراجین خیر سفینة
ذهبتم فابکیتم و ذاحالُ کلِّ مَنْ — بکیٰ خاشعا للہ فی کُلِّ خلوة
وقار بنی نحسٌ و فارق سعدُنا — وخالفنی جَدّی وصارع شقوتی
فیبکیك ارض مع سماءٍ وانجُمٌ — وبرٌّ وبحرٌ ثمّ حیتان لُجَّةٍ
ویبکیك مشکوٰةُ المصابیح بعدما — خلت من مصابیحٍ و انوار بهجةٍ
اشیخ شیوخی من یعدّك مَیّتًا — وذکرك مسكٌ فاح فی کل حَفلةٍ
اشیخَ الشّیوخ اذهب فواللہ لم تمت — وهل مات من قد خاض فی بحر رحمةٍ

اشیخ الشیوخ اذهب فنبکیك دائما
اذا اَقبلت شمسُ السّما او تولّتِ

ترجمہ : میرے رفیقو! ٹھہرو۔ دوستوں کے گھروں کے کھنڈرات پر نوحہ کریں جو مدّتِ طویل سے اجڑے پڑے ہیں استاذ العلماء کی جدائی کے سبب۔

(مولانا رسول خاں صاحب مرحوم کے) قصبہ "اچھڑیاں" اور "لاہور" میں وہ نشانہائے محفل ہیں جن میں ہم نے محبتِ خدا کے لبالب پُر پیالے نوش کیے تھے۔

اے میری ناقۂ سفر! "اچھڑیاں" میں ذرا ایک ساعت ٹھہر تاکہ ان قبروں کی زیارت کرلیں جن میں ایک قبر شیخ المشائخ (مولانا محمد رسول خاںؒ) کی ہے۔

مولانا رسول خاں کی قبر ایک روشن باغیچہ ہے اسی جنتی باغیچہ میں علم کا ایک روشن تارا ڈوب گیا۔

اسلام کے لیے سب سے بڑا المیہ بڑے محدث مولانا محمد رسول خاں مرحوم جیسے صاحبِ عظمت کی موت ہے۔

اگر ساری زمین کا چکر لگالیں تو اسکی نظیر نہ دیکھ سکوگے۔ دانا، عزت والا، جمال وجلال کا مجمع۔

اے میرے دل! کیا بات ہے غم کا اتنا جوش کیوں؟ جب کہ سخت قساوت میں تیری شہرت تھی ہاں ہاں، میں نے آنکھوں کو آئندہ کے لیے پنجۂ غم سے آزاد کردیا تھا۔ لیکن میرے شیخ آپ کے غم واندوہ نے آنکھوں کو دوبارہ اسیرِ غم کردیا۔

بے خوابی میری آنکھوں پر غالب ہوئی، اور میرا پہلو اس غم کے بعد بسترِ استراحت سے نفرت کرتے ہوئے دور رہتا ہے۔

آپ کی رحلت پر ہر طرف چیخ پکار زمین پر ساری مخلوق کے غم کی نشان دہی کرتی ہے۔

لوگ حیران ہیں ان کو آسمانی بجلیوں، طوفان باراں، رعد وبرق اور گھٹا ٹوپ تاریکی نے آگھیرا ہے۔

تُف ہو دنیا پر، اس کی کوئی نعمت دائمی نہیں، اور ہم ایک روز بھی اس کے خطرناک حملوں سے چین سے نہیں بیٹھ سکیں گے۔

دنیا کبھی رلاتی ہے اور کبھی ہنساتی ہے۔ پرندے کے پَر کی طرح ہمیں اِدھر اُدھر اُلٹتی رہتی ہے۔

اب کون ہے؟ کہ مشکل احادیث یوں آسان و نرم کرے جس طرح داؤد علیہ السلام لوہے کو جلدی سے نرم کرلیتے تھے۔

اب کون ہے؟ کہ ابن سینا کی کتاب "اشارات" کو حل کرکے اس میں نکتہ سنجی کرے۔

اَب کون ہے کہ تشنگان علم کو ایسا سیراب کرے جس طرح بادل مُردہ زمین کو خزاں کے بعد سیراب کرتا ہے

اب کون ہے کہ "حباری پرندے کی طرح حیران و پریشان لوگوں کو دلائل سے سلف صالحین کا راستہ بتائے۔

اب کون ہے کہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی اشاعت کرے جس طرح آفتاب تاریکی کے بعد اپنی کرنیں بکھیرتا ہے۔

آپ نے مدّت مدید تک احادیث کا ایسا درس دیا جس سے نور علم و دین زمین کے چپہ چپہ میں چمکا۔

کون ہے جس نے آپ کی علمی ضیارت سے استفادہ نہیں کیا؛ لیکن افسوس کہ شکر گزار دنیا میں کم ہوتے ہیں۔

آپ نے بزرگوں کی سیرت و خصلت کو اپنایا اور ہر مجلس میں دینی احکام کو بلند کیا۔

آپ پسندیدہ سیرت اور نیک خیالات والے تھے جو نور سنت مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے روشن تھے

آپ کی علمی بارش سدا برستی رہے گی، آپ کا فضل جاری ہے، اور آپ کا علم امیدواران علم کے لیے بہترین سفینہ ہے۔

آپ رخصت ہوئے تو دنیا کو رُلایا، اور یہی حال ہر اس شخص کا ہوتا ہے جو خلوت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع کرتے ہوئے روتا ہو۔

آپ کے فراق سے گویا ہماری نحوست آئی اور سعادت رخصت ہوئی، میرا بخت مخالف ہوا اور بدبختی غالب ہوئی۔

سوز زمین، آسمان، ستارے، بحر و بر اور سمندر کی مچھلیاں سب آپ پر ماتم کناں ہیں۔

احادیث کی درس گاہیں آپ پر روتی ہیں، کیونکہ آپ کے بعد وہ علمی چراغوں اور انوار سے خالی ہوئیں۔

اے شیخ المشائخ! آپکو مردہ کون خیال کر سکتا ہے، جبکہ آپ کا ذکرِ جمیل ہر محفل میں مشک کی مانند مہکتا ہے۔

اے استاذِ علماء! جایئے، واللہ آپ مرے نہیں کیا وہ شخص مردہ کہلا سکتا ہے، جو رحمتِ خدا کے سمندر میں جا گھسا ہو۔

اے استاذِ فضلاء، جایئے، ہم سدا آپ کے غم میں روئیں گے، آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت۔

شاعرِ اسلام سیّد امین گیلانی

تیّاری کرو

کفر سے پھر بڑھ کے ٹکرانے کی تیاری کرو
جی نہ ڈھاؤ کفر کو ڈھانے کی تیّاری کرو

کفر ہے مایوسی و ماتم مسلماں کے لیے
پھر سے تم میدان میں آنے کی تیّاری کرو

کفر کی تقدیر میں ہے آگ ہی انجامِ کار
کفر پر تم آگ برسانے کی تیّاری کرو

کون جیتا، کون ہارا، مان لیں گے خود، عدو
شرط یہ ہے خود کو منوانے کی تیّاری کرو

شیر ہو جاتا ہے جب زخمی، غضب ڈھلتا ہے پھر
تم بھی بھارت پر غضب ڈھانے کی تیّاری کرو

سومناتی بلبلا اٹھیں، لگائیں گے وہ ضرب
غزنوی کا دَور دُہرانے کی تیّاری کرو

ڈھاکہ و کشمیر کیا، کلکتہ و دہلی پر اب
پرچمِ اسلام لہرانے کی تیّاری کرو

دَورِ حاضِر کے

سیاسی اور اقتصادی مَسائِل

اور

اِسلامی تعلیمات و اشارات

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا سیّد مُحمّد میاں دامت برکاتہم

فرد کی ملکیت۔ تقسیم دولت اور تہذیب اخلاق

انفرادی ملکیّت کو اسلام نے اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ وہ صاحبِ ایمان کو پونجی پتی بنانا چاہتا ہے یا سرمایہ داری سے اس کو محبّت ہے۔

فرد کی ملکیّت کو اسلام نے اس لیے تسلیم کیا ہے کہ انسانیّت کا جوہر نکھرے اور شرفِ انسانیت کی وجہ اور انسانی عظمت کی علت مشاھدہ بن کر سامنے آئے۔

اخلاق کی بلندی انسانیت کا جوہر ہے۔ اسلام فرد کو اس لیے مالک بناتا ہے کہ وہ مکارم اخلاق سے آراستہ ہو۔

بخل، خود غرضی، تنگ نظری، حرص، طمع، حسد وہ ذلیل اور کمینہ خصلتیں ہیں جو شرفِ انسانیت سے میل نہیں کھاتیں یہ بہائم اور درندوں کی خصلتیں ہیں۔ دامنِ انسانیت ان گندی خصلتوں سے پاک ہونا چاہیے۔ مقدّس مذہب کا پہلا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ان گندی خصلتوں سے تقدّس حاصل کرے۔ یہ تقدّس اسی صورت

میں حاصل ہو سکتا ہے کہ فیض رسانی، نفع بخشی، محبت و شفقت، لطف و کرم کے موتی چمکیں اور تاجِ انسانیت کو مرصّع کر دیں، قارون جو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا پونجی پتی تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اس کو خاتمۂ ملکیّت کا نوٹس نہیں دیا تھا، کیونکہ اس سے نہ کسی بہتر خلق کی تربیّت ہوتی تھی اور نہ بُری خصلت کا ازالہ ہوتا تھا۔ صرف ایک جبر و قہر ہوتا اور ظلم کی ایک مثال دنیا کے سامنے آتی۔ حضرت موسےٰ علیہ السّلام نے اس کو یہ نصیحت کی تھی: احسن کما احسن اللہ الیک (سورہ قصص آیت ۷۷)

جس طرح اللہ تعالےٰ نے اپنے لطف و کرم انعام و احسان سے تم کو نوازا ہے، تم بھی اسی طرح خلقِ خدا کو احسان و لطف و کرم سے نوازو۔

یعنی دولت کا مفاد یہ ہونا چاہیے کہ احسان و انعام و لطف و کرم۔ احسان مندی اور شکر گزاری کی فضا جلوہ گر ہو۔ دولت مند ربِّ ذوالجلال کا شکر گزار ہو اور خلقِ خدا پر احسان کرے۔ خلق جو اس کے لطف و کرم سے فیضیاب ہوگی وہ اس کی شکر گزار اور احسان مند ہوگی۔ اس طرح انسانی اخوّت بال و پر پھیلائے گی اور شجرہ انسانیت بار آور ہوگا۔

اسلام یہ ہرگز گوارا نہیں کرتا کہ دولت جس کے معنی ہیں "لین دین" اس کی گردش بند ہو اور چند افراد میں منحصر اور محصور ہو کر رہ جائے۔

آج اگر قارون اور قارون کے حواریوں سے نفرت فطرتِ انسانی کا جزو بن گئی ہے اور یہودیت کو توہین آمیز طعنہ سمجھا جاتا ہے تو صرف قرآنِ حکیم ہی ہے جس نے ان کا تعارف کرایا۔ یہاں تک کہ سرمایہ نواز الفاظ توہین کے الفاظ سمجھے جانے لگے اور ان الفاظ کی تہہ میں سرمایہ داری سے نفرت دلوں میں رچ گئی ہے۔

اسلام دولت کے لیے تقسیم کو لازمی قرار دیتا ہے؛ البتّہ جب تک انسان اپنے ہوش و حواس اور اپنے اختیار میں ہے۔ وہ دولت کی تقسیم خود نہیں کرتا۔ وہ دولت مند سے تقسیم کراتا ہے تاکہ بخل جیسی خصلت

کا روگ دولت مند کے دل سے دُور ہو؛ البتّہ جب انسان موت کا استقبال کرتے ہوئے اپنے اختیارات کو ختم کر دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر زندگی کا ورق لپیٹتے ہوئے جب اس کے اختیارات ختم ہونے لگتے ہیں تو اسلام آگے بڑھ کر تقسیم دولت کا عمل خود کرتا ہے؛ البتّہ غیروں میں نہیں، بلکہ خود اس کی عزیز و اقارب میں اس کے پارچے اور فاشیں تقسیم کر دیتا ہے۔

لازمی تقسیم

زندگی میں لازمی تقسیم وہ زکوٰۃ ہے جو دولت مند پر ہر سال اسی طرح لازمی ہوتی ہے کہ جیسے ہی سال کے آخری دن کی شام ہوتی ہے۔ دولت کا یہ حصّہ اس کی ملک سے نکل کر ضرورت مند کا حق بن جاتا ہے۔ یہ حصّہ اس کا نہیں رہتا۔ اگر اس میں تصرف کرتا ہے، تو وہ دوسرے کے حصّہ میں تصرف کر رہا ہے اور اس کی آمیزش سے اپنے پورے مال کو ناپاک کر رہا ہے۔

یہ حصّہ اس کی مِلک سے اس درجہ خارج ہو گیا کہ اگر وہ کسی مصلحت یا حماقت سے پورے مال کو دریا میں غرق کر دے یا کسی اور طرح تباہ کر دے، تو زکوٰۃ کا حصّہ اس پر پھر بھی واجب الادا رہے گا، کیونکہ یہ حصّہ اس کا نہیں رہا تھا۔ اس حصّہ کو تباہ کر کے اس نے دوسرے کا حق تباہ کیا ہے۔

جذبۂ دولتمندی اور سرمایہ داری کا استیصال

جس کو ہم دولت سمجھتے ہیں ابھی اس کا وجود بھی نہیں ہوتا کہ اسلام دولت مندی کے مطالبات اس پر لازم کر دیتا ہے۔

اگر چوّن تولہ چاندی کسی کے پاس ہے، تو عرف اور محاورہ میں اس کو دولت مند نہیں کہا جاتا۔ مگر اسلام اس کو دولت مند قرار دیتا ہے اور اس پر وہ مطالبہ عائد کر دیتا ہے جو دولت مند پر عائد ہوتا ہے۔ اگر رمضان شریف کی ۳۰ تاریخ کو کسی کے پاس چوّن تولہ چاندی اس کی ضروریات سے فاضل ہے، تو اگلی صبح کو جس طرح بڑے مالدار پر صدقۂ فطر واجب ہے اس پر بھی صدقۂ فطر واجب ہے کہ اپنی اور اپنے متعلقین کی طرف سے جن کی پرورش اس کے ذمّہ ہے فی کس پونے دو سیر گیہوں یا اتنے گیہوں کی قیمت ضرورت مند کو دے۔

بقرعید کے موقعہ پر ایک قربانی واجب ہو جاتی ہے اور جب سال ختم ہو گا، تو اس کا چالیسواں حصّہ ادا کرنا ہو

گا۔ جیسے جیسے دولت بڑھتی رہے گی زکوٰۃ کی رقم بھی بڑھتی رہے گی مثلاً جب ایک لاکھ کا سرمایہ ہو جائے گا، تو ڈھائی ہزار سالانہ زکواۃ کی رقم ادا کرنا ہو گی۔ اب اگر اپنی اس پونجی کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے، تو وہ مجبور ہے کہ تجوری سے نکال کر مارکیٹ میں لائے اور اس سرمایہ میں گردش پیدا کرے، ورنہ تقریباً پچاس سال میں یہ تمام رقم زکوٰۃ کے راستہ ضرورت مندوں کے پاس پہنچ جائے گی:

پھر اسلام کی نظر میں سونا چاندی یا مالِ تجارت ہی سرمایہ نہیں ہے بلکہ وہ مویشی بھی سرمایہ ہیں جو دیہات میں بسنے والوں کے پاس ہوتے ہیں۔ گائے، بیل، بھیڑ، بکری، اونٹ، بھینس، بھینسا، ہر ایک جانور سرمایہ ہے۔ ایک مخصوص مقدار (جس کو نصاب کہا جاتا ہے) مقرر ہے۔ اگر کسی کے پاس چالیس بکریاں ہیں، تو وہ ایک نصاب کا مالک ہے اس کو ختم سال پر ایک بکری دینی ہو گی وغیرہ وغیرہ (تفصیلات کتب فقہ میں بیان کی گئی ہیں۔)

پھر یہ تمام خرچ اور آج کل کی اصطلاح میں اپنی دولت کی تقسیم اگر نام و نمود کے لیے ہے یا کسی پر احسان رکھنے یا اپنی کوئی غرض پوری کرنے کے لیے ہے تو اگرچہ قانونی طور پر اس کا فرض ادا ہو گیا ہے، مگر عند اللہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے اس مٹی میں کاشت کی نیت سے دانے بکھیر دیے جو کسی چٹان پر جم گئی تھی جیسے ہی بارش کی بوندیں پڑیں وہ مٹی بہہ گئی ساتھ میں دانے بھی۔ گئے دھلی دھلائی چٹان باقی رہ گئی جہاں نہ کوئی تخم ہے نہ پودا۔ (سورہ بقرہ آیت ۲۶۴)

اسلامی اور ایمانی نقطۂ نظر سے یہ خرچ اس لیے ہونا چاہیے کہ خود اس کی اپنی اصلاح ہو بخل وغیرہ کی بری خصلتوں کے بجائے ہمدردیٔ خلقِ خدا اور لطف و احسان کی خصلتیں نشو و نما پائیں اور سب سے اہم بات یہ کہ بندہ کا جو تعلق اپنے رب سے ہے وہ مستحکم ہو۔ بارگاہِ رب العزت میں اس کو اطاعت شعار بندہ قرار دیا جا سکے۔

ایک طرف جذبۂ سرمایہ داری کی یہ بیخ کنی ہے، دوسری طرف خرچ (یا تقسیم دولت) کی یہ اہمیت ہے کہ:

۱۔ کسی شخص کو نیک نہیں کہا جا سکتا جب تک اس میں یہ بات نہ ہو کہ مال کی ضرورت کے باوجود رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں پر خرچ کرتا رہے۔ مقروضوں کے قرض کی ادائیگی اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں مدد کرتا رہے۔

(سورہ بقرہ آیت ۱۷۷)

۲۔ کسی کو عبادت گزار نہیں کہا جا سکتا جب تک نماز کی طرح زکوٰۃ بھی پابندی سے ادا نہ کرے؛ چنانچہ جہاں

نماز کا حکم ہے (اقیموا الصلوٰۃ) ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا بھی حکم ہے (اٰتوا الزکوٰۃ)۔

۳۔ وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں جس کا پڑوسی بھوکا رہے اور یہ پیٹ بھر لے۔ (حدیث صحیح)

۴۔ صحیح معنی میں پاک باز اور متقی کامل وہ ہے جو اپنا مال اس غرض سے دیتا ہے کہ اس کا دل پاک ہو جائے اور نہیں اس پر کسی کا احسان جس کا بدلہ دے۔ صرف اپنے بلند و برتر پروردگار کی رضاجوئی مقصود ہو۔ (سورۃ واللیل آیت ۱۹ تا ۲۰)

زکوٰۃ کے علاوہ

اگر فاقہ اور افلاس کی وبا ایسی عام ہے کہ زکوٰۃ کی پوری پوری رقم ادا کرنے کے بعد بھی لوگوں کو فاقہ سے نجات نہیں ملتی، تو سورہ بلد کی وہ آیتیں صاحبِ دولت کو مضطرب کرنے کے لیے کافی ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

"کیا (انسان) خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہیں چلے گا۔ کہتا ہے میں نے بے شمار دولت خرچ کر ڈالی (میں نے کھپایا مال ڈھیروں) (حضرت شاہ عبدالقادر صاحب) کیا یہ (انسان) سمجھتا ہے کہ نہیں دیکھا اس کو کسی نے۔ کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں۔ زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے ——— اور کیا ہم نے (خیر و شر یا کامیابی و ناکامی کے دونوں راستے اس کو نہیں بتا دیے۔ پس وہ انسان گھاٹی میں سے ہو کر نہ نکلا (دشوار راستہ طے نہ کیا) تمہیں معلوم ہے گھاٹی کیا ہے۔ چھڑانا کسی گردن کا، مقروض کا قرض ادا کرنا، غلام کو آزادی دلانا، یا کھلانا بھوک کے دن کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی خاک میں لینے والے مسکین کو (محتاج کو)"

ان آیتوں میں دولت کی بھی شرط نہیں، بلکہ ہر وہ شخص جس کو خدا نے یہ قدرتی دولت دی ہے کہ وہ ہونٹوں اور زبان سے بول سکتا ہے جس کو بینائی کی نعمت حاصل ہے اس پر لازم ہے کہ:

اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے شکریہ کے مقروض کا قرض ادا کرے، غلام کو آزادی دلائے، فاقہ زدہ مسکینوں کی امداد کرے اور صرف یہی نہیں کہ اگر اس نے اپنی جانب سے یہ امداد کر دی، تو سبکدوش ہو گیا، بلکہ حکم یہ ہے کہ دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرے یعنی ہمدردی نوعِ انسان اور غربا پروری کی عام فضا پیدا کرے۔

سورہ ماعون کی ابتدا کی آیتوں کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے، اس حکم کا انداز کتنا سخت ہے۔

"کیا تُو نے نہیں دیکھا اس کو جو جھٹلاتا ہے دین کو یہ وہ شخص ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو اور نہیں

ترغیب دیتا (دوسروں کو آمادہ نہیں کرتا) مسکین کو کھانا کھلانے پر" (سورہ ماعون)

دین کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے انصاف کیا ہے اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے روزِ جزا (قیامت)

بہرحال یہ آیتیں تنبیہہ کر رہی ہیں کہ :

تقاضائے دین صرف یہی نہیں ہے کہ خود خرچ کرے، بلکہ تقاضائے دین یہ ہے کہ دوسروں کو بھی آمادہ کرے۔ اگر اس میں سستی کرتا ہے تو گویا سلسلۂ دین کی تکذیب کرتا ہے۔ سورہ الحاقہ آیت ۳۰ تا ۳۲ میں اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔

ان آیات میں کافر کے شدید ترین عذاب کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی بیان کیا گیا ہے "مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیا کرتا تھا"۔ اصولِ فقہ کے لحاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب فاقہ زدہ لوگوں کی امداد پر دوسروں کو آمادہ نہ کرنا موجبِ عذاب ہے تو آمادہ کرنا واجب ہے۔

اس کے علاوہ سورہ ہمزہ اور بہت سی آیتوں کا ترجمہ پہلے ابواب میں گزر چکا ہے۔ یہاں قابلِ توجہ یہ ہے کہ دارالاسلام میں مسکینوں اور ضرورت مندوں کی امداد کا فرض حکومت پر عائد ہوگا اور وہ دولت مندوں کی امداد سے اس فرض کو ادا کرے گی، لیکن جہاں اسلامی نظامِ حکومت نہیں ہے، وہاں ہر دولت مند ان آیتوں کا مخاطب ہے۔ نظامِ حکومت نہ ہونے کے عذر سے وہ ان آیتوں کے خطاب سے سبکدوش نہیں ہو سکتا؛ چنانچہ یہ آیتیں مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی تھیں جب مکہ دارالاسلام نہیں تھا، بلکہ بدترین دارالحرب تھا جہاں مسلمانوں کو سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔

ہم نے صرف قرآنِ شریف کی چند آیتیں پیش کی ہیں۔ احادیث کے لیے ایک کتاب چاہیے۔ مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ نے ان کے علاوہ چند حدیثیں اور علماءِ کرام کے اقوال پیش کیے ہیں جو اہلِ علم کے لیے دلچسپ اور معنی خیز ہیں ملاحظہ فرمائیے۔ (اسلام کا اقتصادی نظام صد ۳۴۶ تا ۳۵۴)

دوسری ضرورتیں

پہلے گزر چکا ہے کہ صرف یتیموں اور مسکینوں کی امداد ہی ملت کی ضرورت نہیں، بلکہ ملت کی اور بھی ضرورتیں ہیں اور بعض ایسی ہیں جو دارالحرب اور دارالکفر میں اور زیادہ اہمیت حاصل کر لیتی ہیں۔ مسلمان کچھ امتیاز رکھتا ہے اسی وجہ سے اس کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ اگر کسی ملک میں وہ اپنے اس امتیاز کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے، تو اس ملک کا نام کچھ بھی رکھیں اور فقہ کے لحاظ سے آپ اس کو کوئی بھی حیثیت دیں اس ملک میں بود و باش اس کے لیے ناجائز نہیں ہوگی، لیکن یہ اس کا فرض ہوگا کہ وہ اپنے اس امتیاز کو قائم رکھے اس امتیاز کو قائم رکھنے کیلئے

اسکو تعلیمی نظام کی بھی ضرورت ہو گی۔ تبلیغ و اصلاح کے حلقے بھی ضروری ہوں گے۔ مدارس، مساجد، مکاتب اور تربیّت گاہیں وغیرہ اس کی حیاتِ ملّی کے لوازمات ہیں۔ ان کے جملہ لوازمات پر زکوٰۃ اور صدقہ فطر کی رقومات صرف نہیں ہو سکتیں، لہٰذا اہلِ استطاعت کا فرض ہو گا کہ وہ ان ضرورتوں کا جائزہ لیں اور ان کے پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ عطیات فراہم کریں یعنی قرآنِ حکیم کی اصطلاح کی بموجب اللہ تعالےٰ کو "قرضِ حسن" دیں۔ ان ملّی ضرورتوں سے بے اعتنائی ملّت کی اور اپنی ہلاکت ہے۔ اس ہلاکت سے بچنے کے لیے اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

"راہِ خدا میں خرچ کرو۔ خرچ سے پہلو تہی کر کے اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو اور نیکی کرو۔ یقیناً اللہ تعالےٰ کی محبت انہیں کے لیے ہے جو نیکی کرنے والے ہیں۔" (البقرہ آیت ۱۹۴)

لازمی تقسیم کی دوسری صورت "ترکہ کی تقسیم"

جب ایک مسلمان اس دارِ فانی سے رختِ سفر باندھنے لگتا ہے اور وقت آتا ہے کہ چار و ناچار اپنے تمام مقبوضات دوسرے کے حوالے کرے تو وہ ملکیّت جس کی حقیقت عاریت تھی اس کا چولہ خود بخود اُتر جاتا ہے۔ زندگی میں اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ یہ تقسیم کرے اور اخلاقی کمالات پیدا کرے۔ اب مالکِ حقیقی خود تقسیم کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ صرف ایک تہائی تک اس کو اجازت دی جاتی ہے کہ اپنی صوابدید کے بموجب خرچ کرے۔ باقی تمام ترکہ میں وہ تقسیم جاری ہوتی ہے جو مالکِ حقیقی نے اس پختگی کے ساتھ طے کر دی ہے کہ کسی کو لب کشائی کی اجازت بھی نہیں ہے؛ چنانچہ واضح طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے:

"دیکھو، تمہارے باپ دادا بھی ہیں اور تمہاری اولاد بھی۔ تم نہیں جانتے کہ نفع رسانی کے لحاظ سے کون سا رشتہ تم سے زیادہ نزدیک ہے؟ اور کس کا حق زیادہ ہونا چاہیے اور کس کا کم، اللہ تعالےٰ کی حکمت ہی اس کا فیصلہ کر سکتی ہے بس۔ اللہ تعالےٰ نے حصّے ٹھہرا دیے ہیں اور وہ (اپنے بندوں کی مصلحت کا) جاننے والا (اور اپنے تمام احکام میں) حکمت رکھنے والا ہے (سورہ نسا آیت ۱۱)

"(یاد رکھو، یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی) حد بندیاں ہیں۔ بس جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرے گا تو اللہ اسے (ابدی راحتوں کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی

ہوں گی۔ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہے گا اور یہ بڑی ہی کامیابی ہے جو اسے حاصل ہو گی، لیکن جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اس کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں سے تجاوز کیا تو (یاد رکھو) اس کو آگ کے عذاب میں ڈال دیا جائے گا وہ ہمیشہ ایسی حالت میں رہے گا اور اس کو رسوا کرنے والا عذاب ہو گا۔"

سورہ نساء آیت ۱۳، ۱۴

بیت المال اور مداخل و مصارف

سمجھانے کے لیے "قومی فنڈ" یا "اسٹیٹ" کا لفظ بھی بولا جا سکتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مبہم الفاظ بیت المال کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتے۔

لفظی معنی کے لحاظ سے اگرچہ بیت المال (مال کا کمرہ) اس مکان کا نام ہے جہاں خلافتِ اسلامی کا مرکزی خزانہ محفوظ رہتا ہو، مگر محاورہ میں اسلامی حکومت کے پورے مالی نظام کو بھی "بیت المال" کہہ دیا جاتا ہے۔ یہی عام مفہوم اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے اور اسی کی آمدنی اور خرچ کے مدّات بیان کرنے مقصود ہیں۔

(۱) زکوٰۃ (۲) صدقۂ فطر (۳) عشر۔ یہ تینوں مد مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہ صرف مسلمانوں سے وصول کیے جائیں گے۔ (غیر مسلم اگر چاہیں تو وہ بھی اس طرح کا نظام قائم کر سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت انہیں مجبور نہیں کرے گی) یتیم بچے، ضرورت مند مسلمان مرد اور عورتیں جو صاحبِ نصاب نہ ہوں۔ ضرورت مند مسافر (ابن السبیل) ان کے مصارف ہیں مسلمان طلبہ کے تعلیمی وظیفے بھی ان مدّات سے دیے جا سکتے ہیں۔

(۴) اوقاف۔ ہر ایک وقف کی آمدنی کا مصرف وہ ہو گا جو وقف نامہ میں درج ہے۔ وہ مصرف نہ رہا ہو یا غلط قرار دے دیا گیا ہو تو یہ آمدنی بیت المال کے ذریعہ قریب تر یا مناسب تر مد میں صرف کی جائے گی۔

(۵) خراج۔ وہ مال گزاری (محصول) ہے جو غیر عشری زمینوں سے لیا جاتا ہے۔ کتبِ فقہ میں عشری اور خراجی زمینوں کی تفصیلات درج ہیں۔ مجاہدِ ملتؒ نے بھی "اسلام کے اقتصادی نظام" میں ان کی تفصیل کر دی ہے۔ مراجعت کی جائے۔

(۶) عشور سمجھانے کے لیے درآمد برآمد کی ڈیوٹی (کسٹم ڈیوٹی) کہا جا سکتا ہے، مگر عشور اور کسٹم ڈیوٹی میں بڑا فرق ہے۔ عشور صرف تجارتی مال پر لیا جاتا ہے ملک کے اندر نہیں لیا جاتا، بلکہ دوسرے ملک سے درآمد و برآمد پر لیا جاتا ہے۔

نصاب کی جو مقدار ہے یعنی چون تولہ چاندی اس سے کم قیمت کے مال پر نہیں لیا جاتا بعض صورتوں میں مقروض سے نہیں لیا جاتا۔ مسلمان اگر زکوٰۃ ادا کر چکا ہے تو اس سے نہیں لیا جاتا غیر ملکی سے اس وقت لیا جاتا ہے جب کہ دوسرا ملک جس سے درآمد یا برآمد ہو رہی ہے وہ بھی لیتا ہو، ورنہ نہیں لیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس عشور کو جس کا دوسرا نام مکس بھی ہے، پسند نہیں کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے لایدخل الجنۃ صاحب مکس مکس وصول کرنے والے کو جنت نصیب نہ ہوگی (ابوداؤد شریف) حدیث ماعز میں ہے (لقد تاب توبتہ لو تابھا صاحب مکس) الحدیث

اسلام کا منشا یہ ہے کہ تعاون باہمی کے اصول پر آزادانہ اور کھلی تجارت جاری رہے۔ خدا کے بندے مسلمان ہوں یا غیر مسلمان ایک ملک اور ایک قوم کے ہوں یا ان کے ملک اور ان کی قومیں مختلف ہوں ایک دوسرے کے لیے سہولتیں فراہم کریں، ایک دوسرے کو نفع پہنچائیں، باہمی روابط اور تعلقات بڑھیں تاکہ انسانی اخوت جلوہ گر ہو، لہٰذا اسلامی مملکت اپنی طرف سے کوئی ٹیکس نہیں لگائے گی؛ البتہ دوسرا ملک ٹیکس وصول کرتا ہے، تو قانون اسلامی (فقہ) کا اصول یہ بھی ہے کہ نقصان کا سدِباب کیا جائے۔ "الضرر یزال" لہٰذا اس حد تک کہ اسلامی مملکت نقصان نہ اٹھائے ٹیکس لگایا جائے گا لیکن ایک مسلمان حاکم کو اس کے وصول کرنے میں کس درجہ احتیاط برتنی چاہیے۔ صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ بالا ارشاد گرامی اس کو تنبیہ کر رہا ہے کہ اگر وہ بھی عام انسپکٹروں کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور اپنی کسی قسم کی بے اعتدالی سے اس تعاونِ باہمی کے سلسلہ بین الاقوامی تجارت کو متاثر کرتا ہے، تو دوزخ کا دروازہ اس کے لیے کھلا ہوا ہے وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ واللہ اعلم)

شرح: عشور "عشر" سے ماخوذ ہے (دسواں حصہ) پس غیر ملکی، غیر مسلم سے دس فیصدی دارالاسلام کے غیر مسلم سے وہ ملکی ہو یا غیر ملکی صرف اس مال کا ٹیکس وصول کیا جائے گا جس کو یا برآمد کر رہا ہے۔ اس کی دکان پر یا گودام میں جو مال ہے یا اس کے گھر میں جو زیور یا نقد کی شکل میں سونا چاندی ہے۔ اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور مسلمان کے تمام مال بلکہ تمام اثاثہ پر زکوٰۃ واجب ہے وہ دکان میں ہو یا گودام میں یا مکان میں نقد کی شکل میں یا زیور وغیرہ کی شکل میں۔ بس مسلمان

ہے اس درآمدی اور برآمدی مال میں اگرچہ ڈھائی فیصد وصول کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کو کل مال پر اس نسبت سے ادا کرنا ہوتا ہے تو اس کا اوسط غیر مسلم سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک غیر مسلم کا کل اثاثہ اگر ایک لاکھ ہے اور اس نے دو ہزار کا مال درآمد یا برآمد کیا ہے، تو اگر غیر ملکی ہے تو اس سے دو سو روپے اور ملکی ہے تو اس سے سو روپے اور مسلمان ہے تو اس سے پچاس روپے لیے گئے، لیکن چونکہ مسلمان کو کل اثاثہ ایک لاکھ پر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، تو بیت المال کو اس سے سال میں صرف پچاس روپے نہیں، بلکہ ڈھائی ہزار روپے وصول ہوں گے۔ جب کہ غیر مسلم سے صرف سو یا دو سو وصول ہوئے تھے۔

علاوہ ازیں غیر مسلم غیر ملکی سے دس فیصدی اس وقت ہے جب کہ وہ بھی اسی نسبت سے وصول کرتے ہوں اور اگر وہ اس سے کم وصول کرتے ہیں تو دار الاسلام کے انسپکٹر بھی اس سے کم ہی وصول کریں گے۔ لانا احق بالمکارم۔ (یعنی دار الاسلام والوں پر زیادہ ضروری ہے کہ ان کے اخلاق بہتر اور بلند تر ہوں) مزید تفصیلات کتب فقہ میں ملاحظہ ہوں۔

(۷) جزیہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر حملہ کیا۔ وہاں کے یہودیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ بالآخر ایک معاہدہ کر لیا۔

"حکومتِ اسلام کو حق ہوگا کہ جب ضرورت سمجھے خیبر کو یہودیوں سے خالی کرائے، مگر جب تک وہ رہیں گے، اراضی پر بدستور قابض رہیں گے؛ البتہ پیداوار کا نصف حصہ حکومت کو ادا کرتے رہیں گے۔" جب تک یہودی خیبر میں رہے اسی معاہدہ پر عمل ہوتا رہا۔ طے شدہ حصے کے علاوہ ان سے نہ خراج لیا گیا نہ جزیہ۔ (المبسوط للسرخسی ص۳۷ ج ۲۳)

اسی طرح کسی بھی مرحلہ پر کسی قوم یا کسی آبادی سے کوئی معاہدہ ہوجاتا ہے تو قرآن حکیم کا حکم ہے۔

"اوفوا بالعقود" ان معاہدات کو پورا کرو۔ (سورہ مائدہ)

"اوفوا بالعهد" عہد کو پورا کرو۔ (بنی اسرائیل)

اس طرح کے معاہدے طرفین کی صوابدید پر اور مفتوح قوم کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہوں گے۔ کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۴۰۸، ۴۷۹ (صفحہ ۱۷۷، ۱۷۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دورِ مسعود میں جو معاہدے ہوئے وہ تاریخ طبری فتوح البلدان بلاذری سیر کبیر (امام محمد) مبسوط (شمس الائمہ سرخسی) وغیرہ میں محفوظ ہیں۔

ان معاہدات کی شرطیں مختلف تھیں؛ البتہ ایک بات سب میں مشترک تھی کہ فاتح اور حکمران جماعت سے زیادہ مفتوح

اور مغلوب قوموں کی سہولت کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ پھر معاہدہ پر عمل اس احتیاط سے ہوتا تھا کہ خیبر کے یہودی جو مسلمانوں سے بہت گہری پرخاش رکھتے تھے (یہاں تک کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں ایک مرتبہ ایک عورت کے ذریعہ زہر بھی دُلوا دیا تھا) جب انہوں نے اس احتیاط کا مشاہدہ کیا جو معاہدہ پر عمل درآمد کے سلسلہ میں مسلمان افسر، (شہید موتہ سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ) نے برتی تھی تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا: "بھذا قامت السموٰت والارض" انصاف یہی ہے جس کے سہارے زمین اور آسمان قائم ہیں"

(فتوح البلدان ص ۴۱ کتاب الاموال ص ۴۸۲ فقرہ ۱۴۳۷)

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں حمص فتح ہوا وہاں کے عیسائی باشندوں سے معاہدہ کے مطابق خراج لیا گیا لیکن پھر ہرقل (شہنشاہ روم الکبریٰ) کی فوجوں کا دباؤ بڑھ گیا اور مسلمانوں کو عارضی طور پر حمص سے ہٹنا پڑا تو جو خراج وصول کیا تھا وہ واپس کر دیا کہ

قد شغلنا عن نصرتکم والدفع عنکم فانتم علی امرکم (فتوح البلدان ۱۴۳)

ترجمہ: اب ہم دشمن کے مقابلہ میں مصروف ہوں گے تمہاری امداد اور تمہارا دفاع نہیں کر سکیں گے۔ آپ لوگوں کو اپنا انتظام خود کرنا ہوگا۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۳۸، ۱۳۹ (فصل فی الکنائس والبیع والصلبان)

(۲)

لیکن اگر کوئی معاہدہ نہیں ہوا، مگر یہ مفتوح افراد حکومت سے تعاون کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جنگ کے موقع پر اپنی فوج بنا کر کسی مسلمان جرنیل کی زیرِ قیادت مسلمانوں کی جنگی مہم میں شریک ہوتے ہیں تو "خمس" کا حق جو مسلمان مجاہدین کو ملتا ہے پورا پورا ان کو بھی ملے گا۔ (شرح سیر الکبیر للامام محمدؒ ص ۳۰۹)

اور اگر مسلمانوں کی فوج میں شریک ہو کر جنگی خدمات انجام دیتے ہیں تو "خمس" کا پورا حصہ تو نہیں البتہ ان کی خدمات کے پیشِ نظر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ان کو مناسب حصہ دیا جائے گا۔ (حوالہ مذکور و مبسوط وغیرہ)

لیکن اگر اس طرح کا تعاون نہیں کرتے، بلکہ اگر ان کو مجاہدین کے ساتھ بھیجا جائے تو اندیشہ ہے کہ ان کی شرکت خطرناک ہوگی۔ اس بنا پر ملکی دفاع اور تحفظ کی پوری ذمہ داری مسلمانوں ہی کو برداشت کرنی پڑتی ہے تو اس صورت میں ان پر جزیہ لازم

ہوتا ہے۔ حضرات فقہاؒ نے تصریح کر دی ہے کہ دولت سمیٹنا جزیہ کا مقصد نہیں ہوتا، بلکہ محض جزوی تدارک اس کا مقصد ہوتا ہے۔

بے شک یہ ایک امتیازی ٹیکس ہوتا ہے جو مسلمانوں پر نہیں ہوتا، صرف غیر مسلموں پر ہوتا ہے اور چونکہ ایک مذہبی حکومت کی طرف سے ہوتا ہے تو اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ مذہب کی طرف متوجہ ہوں، مسلمانوں کے طریقوں کو پرکھیں اور ان کے ذہن مطمئن ہوں تو یہ مذہب قبول کریں۔ (المبسوط صہ ۷۸)

مگر جہاں تک مالی مفاد کا تعلق ہے تو جزیہ کو ان مالی ذمہ داریوں سے کوئی نسبت نہیں ہوتی جو مسلمانوں پر عاید ہوتی ہیں۔

(۳)

قرآن پاک کی تصریحات کے بموجب مسلمان "حزب اللہ" اور "انصار اللہ" ہیں۔ ان کی جانیں اور تمام مال خُدا کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ (سورہ توبہ)

جہاد ان پر فرض ہے۔ دفاع ان پر فرض ہے، لہٰذا ان کو جان بھی قربان کرنی ہے اور مال بھی۔ یہ قربانی ان کے ذمہ نہیں ہے جن سے جزیہ لیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دورِ مسعود میں رمضان ۸ھ میں مکہ پر فوج کشی ہوئی۔ حنین اور طائف کے غزوات پیش آئے، ان سے چند ماہ پہلے غزوہ موتہ اور چند ماہ بعد رجب ۹ھ میں غزوہ تبوک ہوا۔ ان تمام غزوات خصوصاً تبوک کی مہم کے وقت حالات نہایت نازک تھے۔ مہم اتنی بڑی کہ تیس ہزار مجاہدین نے شرکت کی، جس کی نظیر اس وقت تک اسلامی تاریخ میں نہیں تھی۔ ایک ماہ کی مسافت کا سفر طے کرنا پڑا۔ بیت المال کا اس وقت تک وجود ہی نہیں تھا۔ ایک طرف فصل تیار دوسری طرف مسلمانوں کے ہاتھ خالی۔ اس تنگدستی کے باوجود تمام خرچ مسلمانوں نے برداشت کیا۔ ان تینوں معرکوں سے پہلے خیبر فتح ہو چکا تھا۔ جہاں کے یہودی کافی مالدار تھے، مگر ان معرکوں کے نام پر کوئی ٹیکس تو کیا لگایا جاتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی یہودی یا عیسائی سے اپیل بھی نہیں کی۔ صرف مسلمانوں سے چندہ کیا اور مسلمانوں نے حیثیت سے بڑھ کر چندہ دیا اور صرف مسلمانوں ہی نے ان تمام مہموں میں شرکت بھی کی کیونکہ یہی تھے جو رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے خدا کے ہاتھ اپنے آپ کو بیع کر چکے تھے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ الخ (سورہ بقرہ آیت ۲۰۷)

(۴)

جہاد کے مصارف تو درکنار جزیہ کی وہ نسبت بھی نہیں جو زکوٰۃ کی ہوتی ہے۔

جس کے پاس دس ہزار درہم (تقریباً تین ہزار روپے) ہوں اس کو ۴۸ درہم (تقریباً بارہ روپے) سالانہ ادا کرنے ہوں گے جو جزیہ کی سب سے بڑی مقدار ہے۔ (درمختار)

دس ہزار درہم سے زیادہ کتنی ہی دولت اس کے پاس ہو، مگر اس کو سالانہ اڑتالیس درہم ہی ادا کرنے ہوں گے۔ لیکن مسلمان کو دس ہزار پہ ڈھائی سو۔ بیس ہزار پہ پانچ سو۔ چالیس ہزار پہ ایک ہزار ادا کرنے ہوں گے۔ اور جس قدر دولت بڑھتی رہے گی، اسی تناسب سے زکوٰۃ بڑھتی رہے گی۔

(۵)

زکوٰۃ بوڑھے، جوان، مرد، عورت، نابینا، اپاہج، بیمار، تندرست، تارکِ دنیا یا دنیا دار ہر مسلمان پر فرض ہے۔ صرف نصاب کا مالک ہونا اور سال کا گزرنا شرط ہے۔ مگر جزیہ ان میں سے کسی پہ لازم نہیں ہوتا۔

جزیہ چونکہ اس نصرت اور اعانت کا تدارک قرار دیا گیا ہے جو بسلسلہ دفاع اس شخص سے مل سکتی ہے۔ لہٰذا انہی پہ لازم ہوتا ہے جو اپنے بدن سے نصرت اور مدد کر سکتے تھے۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، معذور چونکہ جسمانی طور پر جنگ میں کوئی مدد نہیں کر سکتے لہٰذا ان پر جزیہ بھی لازم نہیں ہوتا۔ سیاسیات سے کنارہ کش، تارکِ دنیا، سادھو یا راہب وغیرہ بھی جزیہ سے مستثنیٰ رہیں گے۔ متوسط درجہ کے لوگوں کا جزیہ اس سے نصف ہوگا یعنی ۲۴ درہم سالانہ (تقریباً چھ روپے) اور معمولی درجہ کے لوگوں پر صرف بارہ درہم[1] سالانہ (تقریباً تین روپے) (کتاب الخراج لابی یوسف صہ ۱۲۲)

بہرحال بیت المال کی آمدنی کا ایک مدیہ بھی ہے جس کو جزیہ کہا جاتا ہے۔

۸۔ اموال فاضلہ

معینہ مدات کے علاوہ بیت المال کی متفرق آمدنی کو اموال فاضلہ کہا جاتا ہے مثلاً کوئی لاوارث مرا، اس کا ترکہ یا بجرم بغاوت کسی کا مال ضبط کیا گیا تو اس کا یہ مال بمد اموال

---

[1] بارہ درہم کے بھی صرف دس درہم رہ جائیں گے۔ اگر وہ چاندی کے بجائے سونے کے (دینار) کی شکل میں ادا کریگا۔ بخاری صہ ۴۴۷) شیخ ابن ہمام رحمۃ اللہ نے تصریح کی ہے کہ ایک دینار دس درہم کا ہوتا ہے مگر جزیہ کے سلسلہ میں بارہ درہم کا مانا جائے گا۔ یہ ہے حکومت کی سیر چشمی اور اہلِ ملک کے حق میں رعایت۔

؛ مد مت مال میں جمع کیا جائے گا۔

۹۔ خُمس اسلام نے جہاں مذہبی معاملات کی اصلاح کی، جہاد کو بھی مذہب اور دین کا ایک جزو بنا دیا اور اس کے قاعدوں اور ضابطوں میں بھی اصلاحات کیں۔ جہاد کا مقصد معین کیا کہ:

"راہِ خدا میں خدا کے لیے حق کا بول بالا کرنے کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دینا"

جب یہ مقصد ہے تو ایک مجاہد جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ خدا کا ہے، اس کا نہیں ہے۔ اس کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہیے۔ اس کو اس نظام کے حوالہ کر دینا چاہیے جو اس لیے کارفرما ہے کہ خدا کا حکم اور اس کا مقرر کردہ قانون نافذ کرے۔

جاہلیت کے دورِ قدیم ہی میں نہیں، بلکہ تہذیبِ جدید کے موجودہ دور میں بھی فوج کے سپاہی اخلاقی ذمہ داریوں سے آزاد مانے جاتے ہیں۔ وہ صرف شہر ہی فتح نہیں کرتے، بلکہ شہری آبادی کی انفرادی ملکیتیں حتیٰ کہ اس کی عصمت اور آبرو بھی فتح کر لیتے ہیں۔ موقع مل جاتا ہے تو ان کی دست درازی خود اپنے شہریوں کو بھی معاف نہیں کرتی۔ بیسویں صدی کی لڑائیوں کے بے شمار مشاہدات اس کی شہادت دے رہے ہیں۔

لیکن اسلام نے جب جہاد کو مذہبی فریضہ قرار دیا تو وہ تمام اخلاقی پابندیاں بھی لازم کر دیں جن کا مذہب معلم اور داعی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مجاہد فی سبیل اللہ اور "ایثار شیوہ" (قربان ہونے والا) شریف و با اخلاق مردِ مومن ایک ہی مفہوم کی دو تعبیریں ہیں۔

خیانت بہت بڑا جرم ہے۔ لیکن اگر مجاہد خیانت کرتا ہے، تو گویا ایک حاجی احرام باندھ کر خانہ کعبہ میں چوری کرتا ہے۔ یہ شرمناک بھی ہے اور موجبِ عتاب بھی۔

"میدان جنگ گرم تھا۔ ایک مجاہد عین معرکہ میں جاں بحق ہو گیا۔ لوگوں نے کہا: درجۂ شہادت حاصل کر لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم غلط ہے۔ میں نے دیکھا ہے یہ عذاب میں مبتلا ہے۔ ایک عبا جو اس نے چھپا کر رکھ لیا تھا وہ آتشین پیراہن بنا ہوا ہے۔ اس کے شعلے اس کے اوپر بھڑک رہے ہیں۔" (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

لوگوں نے اس کا سامان دیکھا تو ایک عبا برآمد ہوا جو اس نے غنیمت میں حاصل کیا تھا اور جمع کرنے کے

ایک مکتوب

مرسلہ
جناب پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی

محترم المقام مدیر انوارِ مدینہ السلام ورحمۃ۔ سلام مسنون کے بعد۔ آپ کا فرستادہ رسالہ انوارِ مدینہ پہنچا۔ ظاہری و باطنی محاسن کو دیکھ کر انوار کی آنکھوں میں انوارِ مدینہ کے انوار سما گئے جس کی طباعت، کتابت وسلیقہ نیز معانی ومضامین کے رسالے میں دھارے بہتے دیکھے۔ میرے نزدیک یہ رسالہ ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس رسالے کے قلمی اور علمی تعاون کے سلسلے میں رسالے کے نام کی مناسبت سے سرِدست اپنے چند غیر مطبوعہ اشعار پیشِ خدمت کر رہا ہوں شاید پسند آئیں۔ یہ اشعار اس ہیچمیرز نے اس وقت لکھے تھے جب کہ ہماری بس دیارِ حبیب کی طرف رواں دواں تھی، شوقِ دیارِ رسالت اور بے تابی دیدار مرکز نبوت نے مجھے گنگنانے پر مجبور کر دیا۔ ناگاہ رات کے آخری حصے میں جبکہ ابھی تاریکی فضا میں چھائی ہوئی تھی، انوارِ مدینہ نے دل پہ ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ ذرا تاریکی چھنٹ کر مغرب میں غائب ہوئی تو سبز گنبد نظر آیا اور تمنا بر آئی۔ انہی کیفیات میں میرے جذبات نے وہاں پہنچنے سے پہلے اور بعد ازاں دل میں ہلچل پیدا کر دی۔ تو بہ مَیں اشعار کی تمہید اور پس منظر میں آگے بڑھا جا رہا ہوں، لہٰذا اشعار پیش کرتا ہوں انکو شائع کر کے میرے قلمی تعاون کا آغاز فرمائیے۔ پھر کوئی مضمون بھیجوں گا۔ انشاءاللہ تعالےٰ۔ خدا کرے کہ آپ کا مدرسہ بھی دیکھ سکوں۔ اگرچہ فوٹو نظر سے گزر چکا ہے۔ والسلام

انوارِ مدینہ

مدینے کی جانب چلا جا رہا ہوں — سکونِ دلِ مضطرب پا رہا ہوں
تمنّا بر آنے کو ہے اپنے دل کی — تمنّا کی دنیا لیے آ رہا ہوں
نظر آنے والا ہے اب سبز گنبد — میں آج اپنے آقا کے گھر جا رہا ہوں
فدا ان پہ جاں اپنی جا کر کروں گا — کہ جن کے لیے جاں لیے جا رہا ہوں
مَیں سر اپنا رکھ دوں گا قدموں میں اُنکے — بہت اپنے ماضی پہ شرما رہا ہوں
جبیں پہ پسینہ ہے آنکھوں میں آنسو — بآبِ ندامت بہا جا رہا ہوں
مجھے بخشوالیں گے رحمت سے اپنی — یہ امید لے کر چلا جا رہا ہوں

مرا غنچۂ دل ہے کِھلنے کو انورؔ
انہیں دیکھ کر جن کا غم کھا رہا ہوں

عہد عالمگیری کی ایک نادر تالیف

تلخیص و ترجمہ

حضرت سید انور حسین نفیس رقم مدظلہ

اخبار الاولیاء

افغان بزرگوں کا ایک قدیم تذکرہ، جو تا حال طبع نہیں ہوا

مؤلفہ: عبداللہ خوشگی قصوری

باب اوّل: در بیان مشائخ خوشگیان رحمہم اللہ

۱۔ پیر وتّو شوریانی رح خوشگی : انہیں "پیر کبار" بھی کہتے ہیں۔ "تواریخ افغانی" میں ان کا حال مذکور ہے۔ شیخ الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی قدس سرہٗ کے مرید و خلیفہ تھے۔

۲۔ شیخ بتک رح : "مرید و خلیفہ پیر وتّو شوریانی خوشگی" در "تواریخ افغانی" آوردہ کہ "شیخ بتک پسرِ اصلی خوشگی است۔ و اکثر جا مفہوم شدہ کہ پسرِ وصلی است۔ در اصل شریف بودہ و نامِ پدرِ ایشان سیّد عمر بود۔ چوں خدمتِ حضرت شیخ بسیار کردہ حضرت شیخ او را پسر خواندہ۔ ازاں روز نسبتِ اصلی دی منسی شد و بخوشگی اشتہار یافت ــــ مولد و مدفن، ولایت

۳۔ شیخ رکن الدین بتکزئی رح : فرزندِ شیخ بتک، اولیاء کاملین میں سے تھے۔

۴۔ شیخ ملّی رح : فرزند حسین برادرِ پیر وتّو شوریانی۔

۵۔ شیخ خالّو بتکزئی : ساکن قصور

۶۔ شیخ ضحاک رح : ولایت سے قصور تشریف لاکر سکونت پذیر ہوئے۔

بجائے خود اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ (صحاح)

بقدرِ ضرورت کوئی خوردنی چیز تو اس کے لیے مباح ہے۔ ورنہ علاقہ جنگ میں جو کچھ اس کے ہاتھ لگتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ خزانہ میں جمع کرا دے۔ اگر اس میں کوتاہی کرتا ہے تو اپنے جہاد کو رائیگاں اور اکارت کر رہا ہے اور عذابِ جہنم اپنے سر لے رہا ہے۔

جو کچھ مالِ غنیمت میں جمع ہوگا۔ اس کے چار حصّے مجاہدین پر تقسیم کر دیے جائیں گے اور پانچواں حصّہ "بیت المال" میں جمع کیا جائیگا۔ اس کو "خمس" کہا جاتا ہے۔ جو عنوانِ مضمون کا معنون ہے۔ جو علاقہ فتح ہوگا اگر اس کے متعلق محارب قوم سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے تو وہ بھی تقسیم کیا جائے گا جس کی تفصیل "توسیع بیت المال" کے تحت میں آگے آئے گی۔ (انشاء اللہ)

حکومت کو حق ہے کہ کانوں کا انتظام خود کرے۔ اس صورت میں جملہ برآمدات "بیت المال" کی ہوں گی۔ لیکن اگر سونے، چاندی، تانبا، پیتل، لوہے یا رانگ کی کان کسی شخص یا کمپنی کو دے دی گئی ہے تو ان کی پیداوار میں بھی خمس ہوگا۔ یعنی زکوٰۃ کی طرح چالیسواں حصّہ نہیں بلکہ جو برآمد ہوگا اس کا پانچواں حصّہ بیت المال کو دیا جائے گا۔ سمندر سے موتی یا عنبر برآمد کیا جائے تو امام ابو حنیفہؒ تو اس کو مچھلی کی طرح برآمد کرنے والے کی ملک قرار دیتے ہیں۔ اور اس پر خمس لازم نہیں کرتے۔ مگر امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس میں بھی خمس لازم کرتے ہیں۔

(کتاب الخراج لابی یوسف صد۲۱ و صد۲۲)

اعلان
جامعہ مدنیہ میں ۱۶ محرم کو نمازِ جمعہ ملک کے معروف مقرر حضرت مولانا عبدالشکور صاحب دین پوری پڑھائیں گے۔ انشاء اللہ

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

۷۔ شیخ میرک بتکزئی رح : شیخ عبدالرحمن بختیار، میاں اخوند سعید، حاجی گگن اور شیخ بہوکی کے ہم عصر ہیں۔

۸۔ شیخ جہاں بتکزئی رح : درویشِ کامل و عارف مکمل

۹۔ حاجی محمد حولی رح : قطبِ وقت تھے۔ مزار شوراوک میں ہے۔ پکیح و مکران کے بلوچ سلاطین ان کے خدامِ خانقاہ میں سے تھے۔ حاکمِ قندھار بھی ان کی زیارت کو آتا تھا۔

۱۰۔ شیخ اسمٰعیل بن حرمہ جار و بتکزئی و قبیل عزیزئی : درویشِ کامل و مکمل۔ ساکن قصور

۱۱۔ شیخ یوسف بن شیخ یوسف بتک رح : صاحبِ کرامات تھے۔

۱۲۔ شیخ سنکو بتکزئی : صاحبِ کرامات و مستجاب الدعوات۔

۱۳۔ شیخ مصر یخان : ابن شیخ ضحاک بتکزئی رح

۱۴۔ شیخ لالو رح : قائمقام پدر خود شیخ خالو رح

۱۵۔ شیخ عیسیٰ رح : ابن شیخ لالو۔ درویش صاحب تمکین۔ مولد و مدفن قصور۔

۱۶۔ شیخ بازید بتکزئی رح : درویش کامل و مکمل۔ مولد قصور، مدفن خوراجا۔ ان کے تین خلفاء تھے: شیر خان امچوزئی۔ پاینده خان امچوزئی، شیخ صدو براہم زئی۔

۱۷۔ شیخ بدہ : ابن شیخ ملی۔ صاحبِ ولایت و تصرف

۱۸۔ میاں آخوند سعید حسین زئی : حضرت شیخ وتو اور شیخ بتک سے تربیت باطنی حاصل کی۔ مولد و مدفن قصور۔

۱۹۔ حاجی گگن و توزئی : مرید و خلیفۂ شیخ عیسیٰ مشوانی رح۔ سات حج کیے۔ مولد و مدفن قصور محلہ عزیزیان۔

۲۰۔ شیخ حسن بتکزئی : از اولاد شیخ خالو۔ باکمال و صاحبِ حال۔ مولد و مدفن قصور۔

۲۱۔ شیخ بہوکی عزیزئی : قطب العارفین و غوث السالکین۔ موطن و مدفن قصور۔

۲۲۔ پیر رحمت و توزئی : قائم اللیل و صائم الدہر۔ معاصر جہانگیر پادشاہ۔ مولد و مدفن قصور۔

۲۳۔ حاجی میاں عزیزئی : عالم و فاضل و کامل و مکمل۔ موطن و مدفن قصور۔

۲۴۔ شیخ پاینده امچوزئی : مرید شیخ بایزید بتکزئی، مولد قصور، مدفن خورجا۔

۲۵۔ شمون بن حسینؓ : مولد و مدفن ارغسان (علاقہ ولایت) کہ "بیکا توت" مشہور ہے۔

۲۶۔ شیخ شمس الدین بتکزئی رح : درویش مرتاض و متعبد۔

۲۷۔ حاجی احمد بتکزئی رح : از اولاد شیخ خالو۔ سات مرتبہ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ مولد و مدفن قصور۔

۲۸۔ حاجی یحییٰ دتوزئی : صاحب خوارق بسیار۔ از اکابر مشائخ خویشگیان۔

۲۹۔ شیخ الہداد دتوزئی : از اولاد شہاب الدین۔ قائم اللیل و صائم الدہر۔ موطن و مدفن قصور۔

۳۰۔ حضرت مولانا احمد دتوزئی : از اولادِ عارف بمطلع انوار کرامات، منبع آثار الہامات، افضل الفضلاء، اعلم العلماء، اوّل مولانا سعداللہ لاہوری سے تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں حضرت شیخ اسحاق بن کاکو لاہوری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ ان کا فیضانِ علوم ظاہری و باطنی نواح قصور میں بہت پھیلا۔ شیخ احمد کابلی (حضرت مجدد الف ثانی) قدس سرہ سے بہت راہ و رسم محبت تھی۔ شیخ عبداللطیف برہانپوری آپ کے بہت معتقد تھے۔ باہم باقاعدہ خط و کتابت بھی تھی۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے بھی ملاقات تھی۔ مؤلف اخبار الاولیا آپ کے پوتے ہیں۔ مولد و مدفن قصور۔

۳۱۔ شیخ شیر خان امچوزئی : مرید شیخ بایزید بتکزئی۔ ساکن قصور

۳۲۔ شیخ صدو براہم زئی : نام اصلی صدرالدین۔ اولادِ ابراہیم، مرید شیخ بایزید بتکزئی۔ ساکن قصور۔

۳۳۔ شیخ جلو : بن مصری خان بتکزئی۔ صاحب مقامات علیہ و کرامات سنیہ۔ مولد و مدفن قصور

۳۴۔ شیخ عمر لونہ : عرف دیوانہ بتکزئی

۳۵۔ شیخ لوکا، روکا، توکا بتکزئی: صاحب حال و کمال۔ افغان ان سے بہت اعتقاد رکھتے ہیں۔

۳۶۔ حاجی خواجہ اویس دتوزئی : صاحبِ ریاضت و عبادت۔ موطن و مدفن قصور۔

۳۷۔ شیخ ابراہیم بتکزئی رح : ذاکر و شاغل، خلوت پسند۔

۳۸۔ شیخ فتو عزیزئی رح : پیکرِ صلاح و تقویٰ، ساکن قصور۔

۳۹۔ مولانا عبدالواحد رح : تلاوتِ قرآنِ پاک سے بہت ہی شغف رکھتے تھے۔ موطن و مدفن قصور۔

۴۰۔ شیخ یوسف بتکزئی رح : از طلبہ بایزید بتکزئی رح۔ معاصر جہانگیر و شاہجہان بادشاہ۔ ساکن قصور۔

۴۱۔ محمد خان دتوزئی رح : اولیاء کاملین میں سے تھے۔

۴۲۔ محمد خان بن خواجہ خضر بتکزئیؒ : صاحبِ حال و کمال۔ مولد و مدفن قصور۔

۴۳۔ میاں اسحٰق : نواسہ میاں اخوند سعید۔ مولد و مدفن قصور۔

۴۴۔ پیر رحیم داد وتوزئی : صاحب سجادۂ ولایت۔ مولد و مدفن قصور۔

۴۵۔ پیر آدم دتوزئی : حافظ کلام اللہ، حاجی حرمین شریفین۔ دوسری مرتبہ سفرِ حج اختیار کیا۔ بندرگاہ سومنات سے جہاز پر سوار ہوئے۔ قضاءِ الٰہی سے جہاز تباہ ہوگیا جس میں آپ بھی غریقِ رحمت ہوئے۔

۴۶۔ ارزانی عزیز زئی : مرید پیر روشن۔ مولد و مدفن ولایت۔

۴۷۔ الہداد خان عزیز زئی : پیشہ سپاہگری۔ ابتدا میں حالات اچھے نہیں تھے۔ جب اللہ تعالےٰ نے ہدایت کی توفیق دی تو پٹنہ میں شیخ عبدالحی خلیفہ شیخ احمد کابلی (حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ) کے مرید ہوئے اور شغلِ باطنی اختیار کیا اور اپنے ماضی سے متنفر ہوگئے۔ بہت اچھے شاعر تھے۔ قصوری تخلص تھا۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

اے مرہم چاک دل شکر خندۂ تو صاحب نظراں بجان و دل بندۂ تو
ہر لحظہ چہ جائی ترک و تاز است آخر چوں نیست کسی کہ نیست افگندۂ تو

۴۸۔ حاجی رحیم داد حسین زئی : صاحب زہد و ریاضت و مجاہدہ۔ مولد و مدفن قصور۔

۴۹۔ یار محمد بتکزئی : سن کہولت میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور زہد و تقویٰ کی طرف مائل ہوئے۔ مولد و مدفن قصور

۵۰۔ عالم خان غازی بتکزئی : منظورِ نظر مشائخ خویشگیاں۔ مولد قصور، مدفن ولایت۔

۵۱۔ محمد خان ابن شیخ جلو بتکزئی : ابتدائے جوانی میں امورِ نامشروع کی طرف مائل تھے: آخر مشغول بحق ہوئے۔

۵۲۔ شیخ مردان بتکزئی : واصل بحق، کامل مطلق۔ مولد و مدفن قصور۔

۵۳۔ شیخ مالو بتکزئی : نام اصلی اسمٰعیل۔ مولد و مدفن قصور۔

۵۴۔ حاجی میرک سلمہاکؒ : مولد و مدفن ولایت۔

۵۵۔ کابل شاہ بتکزئی : مقتدایانِ عصر میں سے تھے۔ اکثر گجرات اور دکن جاتے رہتے تھے۔ مولد قصور۔ مدفن احمد آباد۔

۵۶۔ شیخ عالم سلمہاک : مولد و مدفن ولایت۔

۵۷۔ مولانا خواجہ تنکزئی : عالم و فاضل، ساکن پشاور۔

۵۸۔ شاہ محمد تنکزئی : ساکن بیرووال، یہ موضع قصور سے تیس کوس کے فاصلے پر دریائے بیاس کے کنارے ہے۔ بادشاہ ہند شیر شاہ سوری ان سے کامل اعتقاد رکھتا تھا۔

۵۹۔ شیخ ابوالخیر تنکزئی : واصل بحق۔ مولد و مدفن بیرووال (مضافات قصور)

۶۰۔ شیخ معروفؒ : بن شیخ مسعود تنکزئی۔ ساکن بیرووال۔ وہیں مدفون ہیں۔

۶۱۔ شیخ داؤد تنکزئی : بن شیخ معروفؒ۔ مولد و مدفن بیرووال۔

۶۲۔ شیخ بابر سلمہاک : ساکن ملک ارغسان۔ مدفن بھی وہیں ہے۔

۶۳۔ شیخ بوجہ سلمہاک : مسکن و مدفن ولایت۔

۶۴۔ شیخ سبہاک سلمہاکؒ : مستجاب الدعوات۔ ساکن ولایت۔

۶۵۔ شیخ سڑگے خلف زئی : یگانۂ روزگار۔ مولد و مدفن ارغسان۔

۶۶۔ شیخ میر احمد : ابنِ حسن تنکزئی۔ مولد قصور، مدفن پٹنہ۔

۶۷۔ میاں خلیل : ابنِ میر احمد؛ مولد قصور، مدفن بیجاپور

۶۸۔ مدو خان : ابنِ دوست محمد خلف زئی۔ مولد قصور، مدفن پٹنگانو (علاقہ دکن)

۶۹۔ شیخ مبارک خلف زئی : مولد قصور، مدفن قصور نزد مزار شیخ بہوکیؒ۔

۷۰۔ شیخ دانکمار : بعض انہیں خوشگی تنکزئی اور بعض غیر افغان تصور کرتے ہیں۔

۷۱۔ شیخ محمد و توزئی : مؤلف اخبار الاولیاء کے جدِ مادری ہیں۔ مولد و مدفن قصور۔

۷۲۔ شیخ خذرو باتو سلمہاک : ہر دو برادر، ساکن ملک ارغسان۔

۷۳۔ شیخ صاحب سلمہاک : از خوشگیان ارغسان۔

۷۴۔ شیخ بایزید و توزئی : از اولادِ شہاب الدین، صاحبِ تقویٰ و ریاضت۔

۷۵۔ عبدالخالق حسین زئی : بزرگ صاحبِ ہمت۔